پرکھ

ڈاکٹر محمد ایوب

پرکھ

ڈاکٹر محمد ایوب

ڈاکٹر محمد ایوب
(استاد پنجابی زبان وادب)
سارہ پبلی کیشنز مکان نمبر ۸۵ گلی نمبر ۹، قاسم آباد جھنگ روڈ، فیصل آباد
موبائل نمبر: 0333-6566519

ASIAN RESEARCH INDEX

Parakh

By

(Dr Muhammad Ayyub)
ARI ID: 1688708668008

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

ضابطہ

نام کتاب: پرکھ
مصنف: ڈاکٹر محمد ایوب
کمپوزنگ: عبدالحفیظ
سرورق: ڈاکٹر عارف حسین عارفؔ
اہتمام: حسنِ ادب فیصل آباد
باراول: 2023ء
تعداد : 500
قیمت : 500روپے

حسنِ ادب فیصل آباد

03217044014

OPEN ACCESS
CC BY
ECO FRIENDLY

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

انتساب

اردو ادب کی خدمت کرنے والے

اُن قلم کاروں کے نام

جنھوں نے فن کی خدمت میں

اپنی زندگیاں صرف کر دیں

ترتیب

- میری بات — ڈاکٹر محمد ایوب — ۵
- دیباچہ — کاشف علی — ۷
- محبت مصطفیٰؐ کے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات ''خوشبوئے محبت'' کی روشنی میں — ۱۱
- خالد جاوید کی نعت گوئی — ۱۵
- طالب حسین کوثری کی نعت گوئی — ۲۱
- ''حقانی رباعیات'' میری نظر میں — ۲۵
- ''خدائے سخن'' کی نظمیں — ۳۵
- سید مبارک شاہ کی ''ہم اپنی ذات کے کافر'' پر طائرانہ نظر — ۴۱
- طاہرہ انعام کی غزلیات پر ایک نظر — ۵۹
- ''اعتبار'' میں عصری شعور اور اٹل سچائیاں — ۶۳
- ادیب انگلش ٹیچرز کی غزلیات — ۶۷
- ''نہیں کوئی مثال اس کی'' پر ایک طائرانہ نظر — ۷۳
- باتیں ''خواب، خوشبو، آئینے'' کی — ۷۷
- راکی ولسن کا ''مینار محبت'' — ۸۳
- عامر خان وسیر کی فردیات — ۸۹
- پروفیسر میاں مقبول احمد کی ''مقبول ضرب الامثال'' — ۹۳
- ماہیا — ۹۵
- امین بابر کی ماہیا نگاری — ۹۹

❖❖❖❖❖❖❖❖

میری بات

ڈاکٹر محمد ایوب

کتاب بینی کا شوق کالج کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ کیونکہ کالج کے مقابلہ مضمون نویسی بعنوان (پاکستان میں مرغی اور انڈے کی پیداوار) میں حصہ لینے کے لیے تیاری کے سلسلے میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد جا کر کافی کتب پڑھنے کا موقع ملا۔ خدائے وحدہ لاشریک کا کروڑ ہا بار شکر ہے جس کی کرم نوازی سے مجھے اس مقابلہ مضمون نویسی میں پہلے انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ اس انعام سے حوصلہ پا کر میں اکثر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھتا رہتا تھا۔ کیونکہ بنیادی طور پر میں پنجابی زبان و ادب کا استاد اور طالب علم ہوں اس لئے اردو زبان و ادب کا مطالعہ واجبی سا رہا۔ میں 1988 جب فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے گورنمنٹ کالج بہاولنگر گیا تو وہاں کی ادبی فضا نے اردو زبان و ادب کے مطالعہ کا موقع فراہم کیا۔ میرے کالج کے ساتھی پروفیسر راؤ مختار شعبہ اردو کی شاعری کی کتاب پر پہلا تنقیدی مضمون اردو میں لکھا جو بعد میں مقامی اخبار میں بھی شائع ہوا۔ پروفیسر موصوف کی حوصلہ افزائی سے اردو لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ اب تک بہت سے تنقیدی و تحقیقی مضمون لکھ چکا ہوں۔ جن میں سے تین مضامین اٹلی اور آسٹریلیا سے نکلنے والے اردو جرائد میں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کیونکہ دوست اکثر اپنی اردو تخلیقات بھیجتے رہتے ہیں اس لئے ان کو پڑھنے کے بعد جو کچھ محسوس کیا اسے الفاظ کے پیراہن میں آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔

کتابی صورت اردو میں میری یہ پہلی کوشش ہے۔ میرا اردو کا ذخیرہ الفاظ بھی زیادہ نہیں جس کی وجہ سے میری تمام تحریروں میں آپ کو بے شمار غلطیاں نظر آئیں گی۔ میری خواہش ہوگی کہ آپ ان کے مطالعہ کے بعد ان کی نشاندہی کریں تا کہ آئندہ ان کا ارتکاب نہ ہو۔ میں

شکر گزار ہوں پروفیسر کاشف علی کا جنہوں نے ان مضامین کے بارے میں اپنی خوبصورت رائے کا اظہار کیا۔اس کے علاوہ میرے شکریہ کے مستحق ڈاکٹر فرید احمد بھی ہیں جنہوں نے اپنی قیمتی وقت میں سے بیک ٹائٹل کے لئے وقت نکالا اور خوبصورت تحریر سے نوازا۔اپنے رب العزت کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ جس کی کرم نوازی سے سے اس کتاب کی اشاعت ممکن ہوئی۔آپ کو پڑھ کر یہ کتاب کیسی لگی بتایئے گا ضرور۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

دیباچہ

کاشف علی

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب اردو تحقیق وتنقید میں ایک نیا اضافہ ہیں۔اس سے قبل وہ پنجابی ادب میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا چکے ہیں۔پنجابی حلقہ ادب میں آپ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔حالیہ چند عرصوں میں انہوں نے اردو ادب کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو ادب میں اپنی پہلی کتاب لکھ ڈالی۔اس کتاب میں شامل بیشتر مضامین ہماری معاشرتی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر محمد ایوب اپنے اردگرد کے معاشرتی حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان مضامین کا مواد اپنے مجموعی مزاج میں پر اعتماد فکری فضا اور گہری وسعت نظر کا حامل ہے۔نبی کریم ﷺ کی ذات سے والہانہ عقیدت ومحبت کا اظہار ان کے مضامین میں ملتا ہے۔انہوں نے نئے نعتیہ اشعار کہنے والے شعراء حضرات کی اصلاح بھی کی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے نام نہاد مذہبی پیشواؤں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے جو مذہب کو اپنے مفاد کیلئے استعمال کرتے ہیں اور بہت سے معاشرتی مسائل پر بھی نظر دوڑائی ہے۔انہوں نے پنجاب کی تہذیب وثقافت کو ادب میں زندہ رکھنے کے حوالے سے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔جملہ مضامین سے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر محمد ایوب کا نقطہ نظر ایک مثبت طرز فکر کا حامل ہے۔انہوں نے اپنے مضامین میں نہایت سادہ الفاظ کا انتخاب کیا ہے جس سے معاشرے کی اصلاح ممکن ہے۔مجھے یقین ہے وقت کے ساتھ ساتھ پنجابی کی طرح اُردو ادب میں بھی ان کی اہمیت میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

کتاب میں موجود تمام مضامین اردو ادب سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ اس سلسلے میں ان کی پہلی کاوش ہے۔تمام مضامین کا تعلق ان کی تنقیدی آراء سے ہے۔جو انھوں نے مختلف مصنفین کی کتب پر تحریر کی ہیں۔کہتے ہیں کسی بھی ادب کی بقائے دوام کے لیے اس میں تنقید کا ہونا لازمی امر ہے۔بقول ٹی ایس ایلیٹ:''تنقید ادب کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی زندگی کے لیے سانس۔''

ناقد کا ذہن اپنے معاشرے کی خاص فلسفیانہ آب وہوا میں نشوونما پاتا ہے۔لیکن حد سے زیادہ تنقید قاری کے ذوق سلیم کو تباہ کر دیتی ہے۔میرے خیال میں "ڈاکٹر محمد ایوب" اس تمام صورتحال سے بخوبی واقف ہیں کیوں کہ ان مضامین کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف ورق گردانی ہی نہیں کی بلکہ جہاں ان کو خامیاں نظر آئیں ہیں۔ان کی مکمل طور پر نشاندہی بھی کی ہے۔جس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(1) بلاشبہ عنبر صاحب شاعر بہت اچھے ہیں جن کے ہاں موضوعات کی بھرمار ہے۔ذخیرہ الفاظ کشادہ ہونے کی وجہ سے موقع محل کے مطابق الفاظ کے استعمال کا فن بھی جانتے ہیں مگر تعریف وہ جو کوئی دوسرا کرے یہاں تو عنبر صاحب اپنی تعریف خود ہی اپنے مُنہ سے کر رہے ہیں۔

یاں عمر خیام آئے رُباعی مری دیکھے
آئے تو رباعی پہ رُباعی مری دیکھے
لکھتا ہوں عجب رنگ میں ہر ایک رُباعی
وہ رنگ ہے ایسی لکھائی مری دیکھے
(حقانی رباعیات میری نظر میں)

(2) شاعری کے علاوہ اس مجموعہ کلام میں ایک طویل سلسلہ ان تحریروں کا ہے جو راکی ولسن نے اس کتاب کے بارے میں مختلف لوگوں کی تحریر کروائی ہیں۔شاعری ص نمبر (29) سے شروع ہو کر ص نمبر 108 تک جاتی ہے۔جبکہ کتاب کے بارے میں تحریر ص نمبر 7 سے 28 تک اور ص نمبر 108 سے 126 تک پڑھنے کو ملتی ہیں، یوں کہا جا سکتا ہے کہ آدھی کتاب مختلف لوگوں کے مضامین سے بھری پڑی ہے جو کسی طور بھی مناسب نہیں۔اگر ولسن صاحب کو اپنی شاعری کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے جاننے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ الگ سے ایک کتاب چھاپ لیتے تا کہ پڑھنے والوں کو انکی زندگی اور فن کے ہر پہلو کے بارے میں زیادہ معلومات ہو جاتیں۔(راکی ولسن کا مینارِ محبت)

(3) اس مجموعہ کلام میں میرے لئے ایک بات بڑی حیرت کا باعث بنی۔جب میں نے ص نمبر 29 پر درج غزل کا مقطع غزل کے آخر کی بجائے غزل کے درمیان میں دیکھا۔ص نمبر 37 پر لکھی غزل میں مقطع دوبارہ آیا ہے۔ایک بار غزل کے درمیان اور دوسری بار آخر میں اسی طرح ص نمبر

42 اور 88 پر درج ان اشعار کا باقی غزل کیساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں بنتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عامر صاحب کے پاس کہنے کیلئے کچھ نہ تھا۔ (عامر خان وسیر کی فردیات)

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے۔ "ڈاکٹر محمد ایوب" کتابوں کا مطالعہ گہری دلچسپی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں جن اشعار کو انھوں نے اپنے مضامین کا حصہ بنایا ہے ان سے ان کی عمیق نظری کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً:

حد امکاں سے باہر تھا بظاہر اُس کا بچ جانا
مگر کیا کیجئے دشمن نے ہمارے منہ پہ تھوکا تھا

تفکر ہو تو اک لمحے کی بینائی غنیمت ہے
وگرنہ سیب ٹہنی سے تو پہلے بھی گرا ہوگا

تحیر شیوۂ پیغمبری ہے اور پیمبر نے
ستارہ دیکھ کر سوچا کہ شاید یہ خدا ہوگا

سائنس وٹیکنالوجی کی دنیا میں جہاں انسان مشینی دور میں رہتے ہوئے خود مشین بن چکا ہے۔ گو کہ سائنس نے انسان کو بہت ترقی دی ہے لیکن اس سے انسان اخلاقی قدروں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ مادیت پرستی اور حصول زر اب لوگوں کی اولین ترجیح بن چکے ہیں۔ اس صورت حال نے انسان کے اندر سے احساس کا مادہ بالکل ختم کر دیا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ اس کا اثر اس روئے زمین پر رہنے والے تمام انسانوں پر ہو۔ "پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب" کی تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ احساس کی دولت سے مالا مال ہیں کسی انسان کے اندر احساسی شعور ہونا یقیناً خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کہاں ہے رشتوں میں اخلاص کی بات آج کل
اکثر تعلق تو محض نبھانے کے لئے ہیں

نہ جانے بے حسی کیا چیز ہوگی
جب احساس پتھر ہو گیا ہے

انصاف کو مرتے ہوئے دیکھا ہے جنھوں نے
وہ لوگ عدالت میں بیان کیوں نہیں دیتے

مذکورہ بالا تنقیدی آراء کو مدنظر رکھا جائے تو یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ "ڈاکٹر محمد ایوب" کا نقطہ نظر بہت گہری طرز فکر کا حامل ہے۔ موصوف اردو شعر و ادب کی تفہیم کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں اور کسی بھی موضوع پر گہرائی سے غور و خوض کیے بغیر اس موضوع پر لکھنے کے لیے قلم نہیں اٹھاتے۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے متنوع اور رنگا رنگ موضوعات سے اپنے مضامین کو جلا بخشی ہے۔ ادب کے ساتھ شغف ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ میں امید کرتا ہوں کے آنے والے دنوں میں ان کے دیگر مضامین کو بھی پڑھنے کا موقع ملے گا۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

مُحبت مصطفیٰؐ کے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات
''خوشبوئے محبت'' کی روشنی میں

نعت عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کے لغوی معنی تعریف یا وصف بیان کرنا کے ہیں۔اگر چہ عربی زبان میں اس مقصد کیلئے مدح کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔مگر ادبی اصطلاح میں لفظ نعت نبی کریم ﷺ کی مدح وتعریف کیلئے مخصوص ہے۔

ہر وہ شعر نعت ہے جو پڑھنے والے یا شاعر کو نبی پاک ﷺ کی ذات گرامی کے قریب کر دے۔جن میں حضور ﷺ کی مدح ہو۔دراصل نعت ان اشعار کا نام ہے جس میں محض پیکر نبوت کے صوری محاسن سے لگاؤ کی بجائے مقصد نبوی ﷺ سے دل بستگی پائی جائے۔جن میں رسالت ماب سے قلبی تعلق موجود ہو وہ مدح یا خطاب بالواسطہ یا بلاواسطہ اور وہ شعر نظم ہو یا غزل،قصیدہ ہو یا رباعی،مثنوی ہو یا مثلث،مخمس نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔البتہ نعتیہ کلام کی معنوی قدر و قیمت کا دارومدار اس کے نفس مضمون پر ہے۔اگر چہ اس کا مقصد ذات رسالت کی حقیقی عظمت کو واضح کرنا اور آقائے دو جہاں کی بعثت کی جو اہمیت نوع انسانی اور موجودات کیلئے ہے اُسے نمایاں کرنا ہے تو وہ صیح طور پر نعت کہلانے کی مستحق ہے۔اور یہ تمام خوبیاں ڈاکٹر محمد مشرف حسین انجم کی نعت گوئی موجود ہیں۔

گو کہ ڈاکٹر صاحب کی نعتیہ شاعری سے آپ کی محبت رسول ﷺ صاف دکھائی دیتی ہے اور آپ نے نعتیہ اشعار میں سیرت نبوی ﷺ کے بیشمار پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔مگر اس تحریر میں آپ کی نعتیہ شاعری کے مجموعے ''خوشبوئے محبت'' کے حوالے سے عام انسان کی زندگی پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ آپ کی نعت کے حوالے سے لیا جائے گا۔ڈاکٹر صاحب نے محبت رسول ﷺ کے پڑنے والے اثرات کو انسانی زندگی میں انفرادی اور معاشرے پر پڑنے والے اثرات کو مجموعی طور پر بیان کیا ہے۔کہتے ہیں کہ ذکر مصطفی ﷺ سے نفرت کی گرد انسانی زندگی سے دور ہوتی ہے اور محبت رسول ﷺ سے زندگی پر نور بن جاتی ہے۔

محمدؐ کی محبت گردھیاں دور کرتی ہے
محمدؐ کی محبت زندگی پر نور کرتی ہے
(ص19)

محبت رسولؐ نام ہے زمانے کی چہرہ دستی سے بچنے اور جہاں میں عزت وآبرو پانے کا۔

محمدؐ کی محبت چہرہ دستی سے بچاتی ہے
جہان آبرو میں شہر ہستی کو سجاتی ہے(ص 3 5)

آپ کی محبت ہمیں فطرت کے قریب رہنا اور نفرت کو بھگانا سکھاتی ہے۔

محمدؐ کی محبت پر سکون رکھتی ہے فطرت کو
جہانِ زندگی میں سرنگوں رکھتی ہے نفرت کو(ص 4 8)

اسی وجہ سے انسان بے خوف وخطر زندگی بسر کرتا ہے اور انسانی سوچ مثبت ہوجاتی ہے۔

محمدؐ کی محبت نے مجھے بے خوف کر ڈالا
مری چشم تخیل کو توانائی سے بھر ڈالا(ص 5 4)

جب انسان محبت مصطفیٰ ﷺ میں بے خوف وخطر زندگی جیئے گا تو اسکی زندگی صبر سے بھر جائے گی اور جبر کی ہر صورت اُس سے دور ہوجائے گی۔

محمدؐ کی محبت جبر سے دل کو بچاتی ہے
ہمیشہ زندگی میں صبر سے دل کو سجاتی ہے(ص 3 7)

جب صبر ہوجائے گا تو انسانی سوچ اس طرح کی ہوگی۔

محمدؐ کی محبت ذہن کو بالیدگی بخشے
ہمیشہ ہر بشر کی فکر کو روئیدگی بخشے(ص 9 7)

اس محبت سے بے چینی دور ہوتی ہے اور چین کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

محمدؐ کی محبت داغ بے چینی مٹاتی ہے
محمدؐ کی محبت چین کو دنیا میں لاتی ہے(ص 0 8)

دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے اور قلب سے نفرت اور دوسری برائیوں کو دور کرنے کا سب

سے بڑا سبب محبت مصطفیٰ ہے۔

محمدؐ کی محبت دل کو نرمی سے سجاتی ہے
ہمیشہ قلب کو عصیاں کی گرمی سے بچاتی ہے(ص 61)

اس سے رنج والم دور ہوتے ہیں اور دل محبت سے بھر جاتے ہیں۔

محمدؐ کی محبت رنج وغم نابود کرتی ہے
محمدؐ کی محبت دل میں رنگ بو بھرتی ہے(ص 85)

اس سے مفلسی دور اور زندگی مسرور ہو جاتی ہے۔

محمدؐ کی محبت مفلسی سے دور کرتی ہے
جہان زندگانی کابدن مسرور کرتی ہے

جو آپ ﷺ سے محبت کرتا ہے اسکی زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ہر عمل قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ اس لئے آپ ﷺ سے محبت کرنے والا بھی قرآنی تعلیمات پر عمل شروع کر دیتا ہے۔

محمدؐ کی محبت زندگی آسان کرتی ہے
ہمیشہ ہر عمل پر سایہ قرآن کرتی ہے(ص 30)

اس محبت کے انسانی کردار پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کو یوں بیان کرتے ہیں۔

محمدؐ کی محبت فرد کو ذیشان کر ڈالے
تخیل، ذہن، جیون میں سدا مسکان بھر ڈالے(ص 141)

اور اس اثر سے انسانی ذہن خوبصورت ہو جاتا ہے۔

محمدؐ کی محبت سوچ کا ساگر سجاتی ہے
محمدؐ کی محبت ذہن کو سندر بناتی ہے(ص 343)

یہ محبت صحابہ کرام کی آنکھوں کا نور اور ان کی محفلوں کی جان ہے۔

محمدؐ کی محبت نور ہے چشم صحابہ کا
محمدؐ کی محبت حُسن ہے بزم صحابہ کا(ص 60)

اسی لئے ڈاکٹر صاحب نے اس محبت کو اپنے دل کی تختی پر لکھ لیا ہے۔

محمدؐ کی محبت میں منور دل کی تختی ہے
اسی الفت میں ہر لحظہ درخشاں اپنی ہستی ہے(ص 65)

آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب بہت آسان الفاظ میں اپنے عشق مصطفیٰؐ کو جس انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ انداز عہد حاضر میں ایک منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ اس انداز سے وہ ہم عصر شعرا کرام میں ممتاز مرتبے پر فائز ہو گئے ہیں۔ یقیناً قاری بھی اس سے متاثر ہوگا۔ اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے گا۔ اس سے معاشرہ میں خوشگوار تبدیلی آئے گی۔ میں اسے سیرت نبوی ﷺ کی تبلیغ کا ایک خوبصورت انداز فکر قرار دیتا ہوں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

خالد جاوید کی نعت گوئی

ادب میں مذہبی شخصیات کی تعریف وثناء کا سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب سے انسان نے اپنے جذبات وعقیدت کو الفاظ میں بیان کرنا شروع کیا ہے یہ سلسلہ دنیا کے ہر ادب اور خطے میں موجود ہے۔ ہر مذہب کو ماننے والے اپنے اپنے انداز میں ان ہستیوں سے اظہار محبت الگ الگ انداز میں کرتے ہیں۔ کہیں ان کی شان میں گیت گائے جاتے ہیں اور کہیں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ اظہار کا ذریعہ کوئی بھی ہو، اصل بات اس عقیدت کی ہے جو ان کے من میں ان ہستیوں کے بارے میں ہے۔

ان ہستیوں کی مدح سرائی انتہائی مشکل کام ہے اس لئے کہ اس ہستی کے شایان شان الفاظ کا انتخاب ایسا ہونا چاہیے جس میں آپکی عقیدت کے ساتھ اس ہستی کی ظاہری و باطنی خوبیاں بھی کُھل کر سامنے آئیں، تاکہ پڑھنے والے پر اس کا اچھا اثر پڑے اور وہ ان کے نقش قدم پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے۔ مدح سرائی کرتے وقت مدح نگار کو انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس میں مبالغہ آمیزی کا خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مگر جو مدح نگار ان ہستیوں کی محبت میں ڈوبا ہوا ہو، وہ یہ کام نہیں کرسکتا۔ ایسے مدح نگاروں میں ایک نام خالد جاوید کا بھی ہے۔

خالد جاوید کی عقیدتوں کا سفر ''خوشبوئے مدینہ'' کی صورت میں شائع ہو کر عاشقان رسول ﷺ میں عقیدت ومحبت بانٹتا ہوا دیکھائی دیتا ہے نعتیہ مجموعہ کلام میں ہر جگہ آپ کی نبی پاک سے محبت عیاں ہو رہی ہے۔ نعت کہنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں یہ کام خالد جاوید جیسا عاشق رسول ہی کر سکتا ہے کیونکہ یہ سب نبی پاک کی نظر کرم سے ممکن ہوتا ہے جب آپ کی نعت گوئی کو عمیق نظروں سے دیکھا جائے تو مندرجہ ذیل پہلو بیان ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نعت کے آغاز میں جاوید صاحب نے آپ کی آمد سے پہلے کے حالات وواقعات کو یوں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ کی آمد سے پہلے عرب معاشرے میں ہر شخص کا اپنا اپنا خدا تھا جس کی وہ پوجا کرتے تھا۔ پیار ومحبت نام کی کوئی شے نظر نہیں آتی تھی اور معاشرے میں ہر طرح ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ یوں کہنا چاہے۔ کہ ہر شخص اپنے وجود سے نالاں تھا۔

زمانہ کتنا برا تھا حضور سے پہلے
ہر ایک کا اپنا خدا تھا حضور سے پہلے
زمانہ مہر و محبت سے جیسے خالی تھا
ہر ایک ظلم روا تھا حضور سے پہلے
ہر ایک شخص تھا نالاں وجود سے اپنے

زمانہ خود سے خفا تھا حضور سے پہلے(ص 8 4)

پھر اللہ کی رحمت جوش میں آئی۔آپؐ دنیا میں تشریف لائے ہر طرف اجالا ہو گیا۔آپ تمام نبیوں کے سردار بن کے آئے اور آپکی تعلیمات سے بکھرا ہوا عرب معاشرہ ایک مرکز پر جمع ہو گیا۔

خدا کے محبوب بن کے رحمت زماں پہ چھائے ہمارے آقاؐ
تمام نبیوں کے ہوئے سرور جہاں میں آئے ہمارے آقاؐ
کرم ہے ان کا سبھی پہ یکساں کہ رحمت للعالمین ہیں
کہ ایک مرکز پہ دیکھ خالد وہ سب کو لائے ہمارے آقاؐ(ص80)

پھر کیوں نہ ایسی ہستی کی تعریف خالق کائنات خود کرے۔

ذکر تیرا ہے ورفعنا لک ذکرک
تعریف خدا آپ بتانے کیلئے ہے(ص 6 6)

اور کسی ہستی کی تعریف خود خدا کرے۔اس ذات بابرکت سے ایسا ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔کیونکہ خدا اپنے محبوب کی تمام باتوں کو مانتا ہے۔

لوٹا بھی تھا سورج چاند کے دو ٹکڑے ہوئے تھے
حیرت تو فقط آئینہ خانے کیلئے ہے(ص 7 5)

جب نبی دو جہاں کیلئے رحمت بن کر آئے تو نظر کرم کی طلب تو بنتی ہے کہا جاتا ہے کہ وائی دو جہاں میری زندگی تاریکیوں میں گھری ہوئی مجھے روشنی کی راہ دکھائیے۔

گھری تاریکیوں میں زندگی میری
ملے روشن مجھے بھی کوئی راہ آقاؐ(ص 9 5)

میں تیرے در کا گدا ہوں مجھے اپنی کملی میں جگہ عطا کریں۔

میں بھی گدا ہوں آپؐ کے در کا
کملی میں اپنی مجھ کو چھپا لیں(ص 9 4)

بروز محشر میرا بھرم رکھ لیں اور غموں کی دھوپ میں سایہ عطا کر دیں۔

بروز محشر میں میرا بھی بھرم رکھنا میرے آقاؐ
اگر ہو پرسش اعمال کملی میں چھپا لینا
غموں کا سلسلہ ہے اور سر پہ دھوپ عصیاں کی
مجھے اے شافع محشر تمازت سے بچا لینا(ص 4 7)

میری کشتی بھنور میں پھنس گئی ہے مجھے کنارہ چاہیے۔

گھری کشتی ہے لہروں میں ہوائیں بھی مخالف ہیں
میری کشتی کو مل جائے کنارہ یارسولؐ اللہ(ص 5 9)

اے محترم ذات میں نے مدینہ دیکھنا ہے اس لئے مجھے اپنے پاس بلالیں۔

شہر مدینہ میری طلب ہے
مجھ کو اپنے پاس بلا لیں(ص 9 4)

میرے آقاؐ میری یہ خواہش پوری کردیں اور مجھے اس سعادت سے بہرہ مند فرما۔

یہ خواہش ہے میرے آقا مدینے میں بلا لینا
سعادت گر یہ حاصل ہو تو مجھ کو اور کیا لینا(ص 4 7)

میں حسرت سے زمانے کو آپ کے در پر جاتا دیکھتا ہوں اگر آپ مجھے اپنے در پر بلالیں تو زمانہ مجھے دیکھے گا۔

میں زمانے بھر کو جاتا دیکھتا ہوں یا نبیؐ
مجھ کو بھی در پر بلا لو کہ زمانہ دیکھ لے(ص 5 7)

اس دعا کو جاوید صاحب ربی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں۔

میرے مولا عطا کر دے زیارت مجھ کو آقا کی
نگاہ کرم مجھ پر تو اے مالک بحر و بر کر دے(ص 1 7)

اس لئے کہ میرا کوئی اور سہارا نہیں ہے جہاں مجھے پناہ ملے۔

سوائے آپ کے میرا کوئی نہیں
میں ڈھونڈوں آپ کے در پہ پناہ آقاؐ(ص 9 5)

اے اللہ میں قیامت والے دن نبی پاک ﷺ کی شفاعت چاہتا ہوں۔

بروز محشر خالد کے لئے بھی
محمدؐ کی شفاعت چاہتا ہوں(ص 1 6)

یہی شفاعت کی خواہش جاوید صاحب کو مدینے کا سفر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ مدینہ پاک دیکھنے کی خواہش کو یوں بیان کیا ہے:

میری طیبہ میں ہو حاضری
آپؐ کا دیکھ لوں میں بھی در(ص 1 5)

وقت نزع دیدار مصطفی ﷺ کی خواہش کا اظہار بہت اچھے انداز میں کرتے ہیں۔

دل خدا کی فقط ایک ہی خواہش ہے حضور

وقت نزع مجھے حاصل ہو زیارت تیری(ص 0 9)

اس محبت کا صلہ یہ ملتا ہے کہ انسان سے ہر قسم کی مصیبت ٹل جاتی ہے۔

تجھ سے خالد ہر مصیبت دور پھر ہو جائے گی
کر کے آقاؐ سے محبت یہ نظارہ دیکھ لے(ص 5 7)

یہی نہیں بلکہ نعت لکھنے کی وجہ سے اہل فن میں بلند مرتبہ بھی حاصل ہوا ہے۔

نعت کی جو سعادت عطا ہو گئی
اہل فن میں ہمیں مرتبہ مل گیا(ص 6 7)

مدینے سے دوری کا احساس ہمہ وقت لاحق رہتا ہے۔اس بے بسی کو کتنے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

جانے کب ہوگی ہماری ان کے در پر حاضری
کب میں پہنچوں گا مدینے دل بڑا بے تاب ہے(ص85)

اے کملی والے آپ کے روضہ اقدس سے دوری بہت تڑپاتی ہے۔اس لئے مجھ پر اپنی رحمتوں کا دروازہ کھول دے۔

آپؐ کے روضے سے آقاؐ دور ہوں میں آج تک
کھول دیں میرے لئے جو رحمتوں کا باب ہے(ص 6 8)

مجھ پر اپنی نظر کرم کریں آپ کا امتی ہوں اور حاضری کو ترس رہا ہوں۔

امتی ہوں آپؐ کا رحمت للعالمین
حاضری کو ترسے خالد سبز گنبد کے مکین
چشم رحمت ہو خدارا
الصلوت السلام(ص 2 1 1)

جہاں شہر نبیؐ سے محبت کا اظہار کر کے ذات اقدس سے چشم رحمت طلب کی جاتی ہے وہاں مدینہ پاک کی ایک ایک شے سے محبت ہے۔یہاں سے مدینہ پاک آنے والی ہوا راحت آموز لگتی ہے۔جاوید صاحب کا خیال ہے کہ جس ہوا کے چھونے سے دلی اطمینان ملے وہ یقیناً شہر نبی سے آتی ہے۔

راحت آموز گیا ہے جو ہوا کا جھونکا
عین ممکن ہے مدینے سے ہی آیا ہوگا(ص 1 8)

دل کو سکون دینے والی ہوا مدینہ اور مدینے کی پوری فضا مثل جنت ہے۔

دل مزیں کا سکوں ہے ہوا مدینے کی

فضائے خلد کی ہمسر فضا مدینے کی(ص 3 8)

جاوید صاحب کی نعت گوئی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ عشق مصطفیٰ کے بیان کے ساتھ ساتھ انسانیت کی اصلاح کیلئے اشعار میں نصیحت کو بھی بیان کیا ہے، کہتے ہیں اے انسان تو تفرقہ بازی سے کیوں ہر جگہ اپنا تماشہ آپ بن رہے ہو۔

ملت تو بن کے توڑ دے بتان رنگ و بو
بنتا ہے کیوں تماشہ اے ناداں ہر جگہ(ص 2 9)

شاعر کا اپنی دھرتی سے پیار اور اپنی ثقافت سے پیار کا اظہار بھی ملتا ہے۔کہا جاتا ہے جب کوا دیوار پر بولے تو اس کا بولنا کسی مہمان کی آمد کی اطلاع ہوتی ہے۔مگر خالد صاحب کے نزدیک دیوار پر کوے کا بولنا نور کی آمد کی اطلاع ہے۔

سوچ آنگن میں نور اترے گا
بولے مینڈھ پر جو کاگے ہیں(ص 8 6)

نعت کے اشعار میں ہمیں مناقب کا رنگ بھی دیکھائی دیتا ہے حضرت امام حسین علیہ السلام کی عظیم قربانی کو یوں یاد کرتے ہیں:

خدا کی راہ میں جس نے لٹا دی جاں اپنی
حسینؑ آج بھی روشن مثال ہے لوگو(ص 7 8)

حضرت بلال کی وفا اور پیار جو آپ کی ذات اقدس سے تھا اس کو یوں بیان کیا ہے:

وفا کا پیار کا جس نے بھرم ہے رکھا وہ
غلام آپؐ کا حضرت بلال ہے لوگو(ص 7 8)

حضرت حسان کی ثناء رسول ﷺ کی بدولت جاوید صاحب کو آقائے کریم کی صفت بیان کرنے کا طریقہ آیا۔

آقا نے مجھے حضرت حسان کے صدقے
لفظوں کو سجانے کا ہنر بخشا قرینہ(ص 3 0 1)

آخر میں شان علی علیہ السلام بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علی علیہ السلام کی ذات وہ ذات ہے جس کو نبی پاک نے اپنا بھائی کہا ہے اور راہ خدا میں مخلوق خدا کی خدمت باکمال کی ہے۔

یہ بھی نسبت خوب ہے مولا علی شیر خدا
بھائی آقا نے کہنا نسبت ہے باکمال
راہ خدا میں خلق کی خدمت ہے لا جواب

خالد مرے علی کی حقیقت ہے باکمال(ص 105)

اگر چہ خالد جاوید کے اس نعتیہ مجموعہ کلام میں آپ کا عشق مصطفیٰ ﷺ ہر ہر لفظ میں دیکھائی دیتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کو نہ صرف دین سے لگاو ہے بلکہ سیرت رسول سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ کیونکہ نعت صرف وہ شاعر کہہ سکتا ہے جس نے تعلیمات نبوی کو اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اس طرح اپنایا ہو، جیسا نبی پاک کی ذات اپنے پیروکاروں سے چاہتی تھی۔ مگر صفحہ نمبر 79 پر جو نعتیں درج ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک کی بجائے دو ہیں۔ پہلے تین اشعار میں ربط ہے مگر اگلے دو اشعار کا پچھلے اشعار سے کوئی ربط نہیں۔ بلکہ میں ان کو حمدیہ اشعار میں اشعار کروں گا مثال کچھ یوں ہے:

اس جہاں میں رب کے احکامات جو پورے کرے
حشر میں اس شخص کی ہی خلد بخشی جائے گی
زندگی میں تو بھی خالد کر خدا کی بندگی
قرب بھی اس کا ملے گا، شان بخشی جائے گی(ص 79)

مضمون کا اختتام بہت ہی دعا پر:

میرے دل کو روشن کر دے
کر دے دور اندھیرے یا رب(ص 46)

اے باری تعالیٰ مدینے میں مستقل رہنے اور مدفن ہونا مقدر میں لکھ دے

مدینے میں رہوں ہر دم وہیں مدفن بھی ہو میرا
دعا اس کے سوا پھر اور کیا ہوگی مدینے میں(ص 55)

❖❖❖❖❖❖❖❖

طالب حسین کوثری کی نعت گوئی

نعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تعریف یا وصف بیان کرنا کے ہیں اگرچہ عربی زبان میں اس مقصد کیلئے مدح کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔مگر ادبی اصطلاح میں لفظ نعت نبی کریم ﷺ کی مدح وتعریف کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔فارسی لغات میں نعت سے مراد نبی کریم ﷺ کے اوصاف اور ثناء بیان کرنا کے ہیں۔اردو زبان کی ''نور اللغات'' میں لکھا ہے۔کہ یہ لفظ معنی مطلق وصف ہے۔اور اس کا استعمال نبی پاک ﷺ کی تعریف وثناء کے بیان کے لیے وقف ہے۔اس لیے نعت کا لفظ عربی، فارسی، اردو، پنجابی اور دیگر زبانوں میں ایسے ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور وہ سارے اشعار اور نظمیں نعت کے گھیرے میں آجاتی ہیں جن میں آپ ﷺ کے محاسن بیان ہوئے ہوں۔اس طرح نعت کا گھیرا وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔چونکہ نعت کا محور آپ ﷺ کی ذات پاک ہے۔اس لیے آپ ﷺ کی ذات سے صفات تک، افکار سے اعمال تک غرض ذات مقدس کا کوئی ایسا پہلو نہیں جو لغت کا موضوع نہ بنا ہو۔اخلاق، سیرت، معجزات، غزوات، خطبات، عبادات، معاملات، عادات، تعلیمات سب کچھ نعت کے گھیرے میں آگئے ہیں۔

نعت کا وجود عربی ادب میں آپ ﷺ کی مبارک زندگی سے ہی نظر آتا ہے۔بہت سارے صحابہ کرام نے آپ ﷺ کی پاک زندگی کے ایک ایک پل کو شعر وادب میں محفوظ کیا ہے۔یہی صحابہ کرام کا ورثہ تھا اور یہی ہمارا قیمتی اثاثہ ہے۔یوں تو اردو ادب میں لاتعداد شعراء کرام نے نبی پاک ﷺ سے عقیدت ومحبت کے اظہار کیلئے نعت گوئی کی، مگر بہت کم شعراء کرام ایسے ہیں جن کی ادب میں پہچان نعت گوئی بنی ہو۔دور حاضر کے ممتاز نعت گو شعراء کرام میں ایک نام جناب طالب حسین کوثری کا بھی ہے۔جنہوں نے اپنی نعت گوئی کے حوالے سے ادب میں بلند مرتبہ حاصل کیا ہے۔طالب حسین کوثری کے ہاں نعت گوئی کا اصل محرک نبی پاک ﷺ ذات بابرکات سے عشق ہے۔آپ کی نعتوں میں یہ جذبہ بہت شدت سے دکھائی دیتا ہے۔جس کی وجہ سے انتہائی خوبصورت اور دل میں اترنے والی نعتیں لکھی ہیں، آپ نے اس جذبے کے اظہار کیلئے موزوں اور مناسب الفاظ کا چناؤ کیا اور پھر ان کو مناسب ترتیب دے کر اشعار کی صورت میں پیش کیا۔آپ نے اللہ کے رسول ﷺ کے ظاہری وباطنی حسن کے ساتھ اسوہ حسنہ کے ہر پہلو کو نعت میں بیان کیا ہے۔آپ کی نعت گوئی کے کچھ موضوعات کا احاطہ اس مضمون میں پیش خدمت ہے۔اس میں کوئی شک نہیں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو باطنی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن وجمال سے بھی توانا ہے۔آپ ﷺ کا

چہرہ مبارک چاند کی طرح روشن اور سورج کی طرح چمکدار تھا۔ جو بھی اس چہرہ مبارک کو دیکھتا ایمان لے آتا۔ آپ ﷺ کی آنکھیں خوبصورت اور بصیرت سے جہان روشن ہوا۔

آپؐ کے حسن بصارت پر ہے مازاغ البصر
آپؐ کے حسن بصیرت سے جہاں روشن ہوا(ص 40)

آپ ﷺ صحابہ کرام کے درمیان تشریف ہوتے تو سب سے ممتاز نظر آتے۔

مجمع اصحاب میں واضح نظر آتے تھے آپؐ
قد میانہ اور اونچا قامت خیر الوریٰ(ص 21)

آپ؟ خلق عظیم کے مالک ہیں۔ کفار سے بھی محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

کیا عظیم المرتبت تھا صاحب خلق عظیم
کافروں کے واسطے چادر بچھا دیتا رہا(ص 28)

امہات المومنین نے قرآن پاک کو آپ ﷺ کا خلق قرار دیا۔

جو پوچھا خلق کے بارے میں ام المومنین بولیں
کہ خلق رحمت اللعالمین قرآن جیسا تھا(ص 29)

چونکہ آپ ﷺ کا کلام قرآن تھا۔ اس لیے تمام صحابہ کرام کو آپ ﷺ کے ارشادات عالیہ میں خاص دلچسپی تھی۔

حدیث پاک سے تھی اس لیے الفت صحابہ کو
کہ ہر جملہ فروزاں آیت فرقان جیسا تھا(ص 29)

زمانے میں آپ ﷺ کے عدل کی مثال نہیں ملتی۔

زمانے میں نہیں منصف محمد مصطفیٰ جیسا
کہاں ایوان ان کے عدل کے ایوان جیسا تھا(ص 29)

نعت میں آپ ﷺ کی ذات اقدس سے منسوب معجزات کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر لکھنے کیلئے نعت گو کا سیرت طیبہ کا مطالعہ، قرآن وحدیث پر گہری نظر اور علم عمرانیات کا جاننا بہت ضروری ہے۔ تاکہ نعت میں گہرائی واثر پیدا کیا جاسکے۔ کیونکہ اگر نعت میں کسی معجزے کا ذکر ہو رہا ہے تو اس کی سند یا حوالہ نہایت احترام کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ محبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ تاثیر دوگنی ہو جائے۔ سورج کے پلٹنے والے معجزے کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

اتر کر آفتاب پلٹ آیا جس کے اشارے سے
اسی کو ماہتاب آسمان نے ٹوٹ کر چاہا(ص 9)

اور یہ سب کچھ آپ ﷺ کی صداقت کی گواہی تھی۔

شمس پلٹا چاند ٹوٹا ٹوٹ کر تارا گرا
آسمان ان کی صداقت کا پتہ دیتا رہا(ص 181)

آپؐ کے ایک اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوا۔آپؐ کی اس طاقت کا کوئی بھی اندازہ نہیں کرسکتا۔

جس کی انگلی کا اشارہ چاند کے ٹکڑے کرے
عقل سمجھے گی بھلا قوت خیر الوریٰ(ص 212)

اور یہ بھی آپ ﷺ کا معجزہ رہا کہ پتھر بولنے لگے۔

آمنہ کے لعل کی معجزہ نمائی دیکھئے
پتھروں کو بولنے کا ڈھب سکھا دیتا رہا(ص 181)

نعت میں تاریخی واقعات کو بیان کرنے سے پہلے اور اس واقعہ کے درست ہونے کی تصدیق لازمی ہے۔کیونکہ غلط حوالے سے نہ صرف لوگوں کے بھٹکنے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔بلکہ نعت باعث ثواب کی بجائے باعث گناہ بن جاتی ہے۔اس لیے علماء کرام نے تاریخی واقعات کو بیان کرنے سے پہلے اس کی صحبت کے درست ہونے پر زیادہ زور دیا ہے۔طالب حسین کوثری نے جو تاریخی واقعات بیان کیے ہیں۔وہ انگوٹھی میں نگینے کی مانند نظر آتے ہیں۔واقعہ عام الفیل کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

تھے توکل کا مرقع آپؐ کے دادا حضورؐ
ہاتھیوں کی بے بسی تھی طائروں کے سامنے(ص 66)

واقعہ معراج نے آج تک کو حیران کیا ہوا ہے۔

معراج پر انگشت بدنداں ہے کائنات
حیرت سراپا بن گئے سدرہ کے سب طیور(ص 99)

اور اس سفر کے دوران وقت رکا رہا۔یہ سب آقائے دوجہاںؐ کی عظمت کی دلیل ہے۔

فلک پہ جانا زمین پہ آنا وہاں کا عرصہ یہاں کا لمحہ
وہ جس کی خاطر زماں کا دھارا رکا ہوا ہے وہ مصطفیٰ ہے(ص118)

موجودہ دور میں لکھی جانے والی نعت کے موضوعات میں بہت زیادہ تبدیلی آ گئی ہے۔اب شعراء کرام مدینے جانے کی خواہش،روضہ انور حاضری کی چاہت گناہوں پر معافی کی طلب،آپ ﷺ کے ہجر میں تڑپنا،روز قیامت بخشش کی سفارش آپ ﷺ پر جان قربان کرنے کی آرزو اور آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ عصری حالات کے تناظر میں اپنے دور کے مسائل و مصائب کا ذکر کر کے سرور کائنات سے مدد کی درخواست بھی کرتے ہیں۔کوثری صاحب لکھتے ہیں کہ امت مشکلات کا

شکار ہے۔مشکل کشائی کیجئے ذلت میں گھرے مسلمان پر نام حسینؑ کے وسیلے سے رحمت کی نظر ڈالیئے۔

امت ہے مشکلات میں یا شاہ بحر و بر
مشکل کشائی کیجئے یا سید البشر
ذلت میں گھر گئے ہیں مسلمان ہر طرف
نام حسینؑ کیجئے رحمت بھری نظر(ص 22)

کئی اشعار میں آیات مبارکہ کو بیان کیا ہے۔انداز ایسا اپنایا ہے کہ روانی متاثر نہیں ہوئی اور پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا کہ غزل کے الفاظ پڑھے جارہے ہیں۔نمونہ کلام اس طرح ہے:

کُل نفس ذائقہ الموت پر ایمان ہے
کاش ہو لب پر دورود پاک جب آئے قضا(ص 41)
خدا کہتا ہے تو لا کمّا کیا خوب کہتا ہے
حقیقت میں جہاں سارے کا سارا مصطفیٰ کا ہے(ص133)

کئی شعراء کرام نعت کو اپنے لیے باعث برکت خیال کرتے ہیں۔کوثری صاحب کا خیال ہے کہ ادب کی دنیا میں اگر انکا کوئی مقام ہے تو وہ صرف نعت لکھنے کی وجہ سے ہے۔

کیسی سخنوری ہے مری شعر گوئی کیا
نعت نبیؐ سے ہے میری عزت بنی ہوئی(ص 47)

کہتے ہیں کہ میری آرزو ہے کہ حشر کے روز نعت میری پہچان بنیاور نعت کی روشنی میری جبین پر سج جائے۔

ہے آرزو کے حشر میں پہچان نعت ہو
یہ روشنی ہو لوح جبیں پر سجی ہوئی(ص 48)

اور اسی نعت کی بدولت ہی حضرت حسان تمام صحابہ کرام میں ممتاز ہوئے۔

کیا ممتازاس کو نعت گوئی کی سعادت نے
وگرنہ ہر صحابی حضرت حسان جیسا تھا(ص 92)

اس مضمون کو میں کوثری صاحب کے ایک نصیحت آموز شعر پر ختم کرتا ہوں۔جس میں آپ مشورہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے مسائل کا حل چاہتا ہیا سچی توبہ کرنا چاہتا ہے۔تو اسے چاہیئے کہ وہ درود پاک پڑھے۔کیونکہ اسکی برکت سے نہ صرف توبہ قبول ہوگی بلکہ سارے مسائل حل ہوجائیں گے۔

توبہ کا بہترین وسیلہ درود پاک
جو چاہتا ہے ختم ہوں عصیاں پڑھے درود(ص 21)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖

''حقانی رباعیات'' میری نظر میں

شاعری ایک خوبصورت اور من موہنی صنف رُباعی ہے۔ رُباعی کا لفظ رُبع سے نکلا ہے۔عربی زبان میں اربعہ کے معنی ''چار'' کے ہیں۔اس وجہ سے ایسی صنف شاعری کو رُباعی کہا جائے گا جس کے چار مصرعے ہوں۔

شاعری کی اصطلاح میں رُباعی اس صنف کا نام ہے جس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں ایک مضمون یا خیال بیان کیا جاتا ہے۔یعنی رُباعی وہ شعری صنف ہے جس میں عروض کے ماہرین کے مقرر کیے ہوئے خاص وزن، خیال کی وحدت اور بیان کے تسلسل کی پابندی بہت ضروری ہے۔

رُباعی میں بیان کے تسلسل اور خیال کی آہستہ آہستہ بڑھوتری کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعے زنجیر کی گھریوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں، الفاظ کا چناؤ موضوع اور خیال کے مطابق ہو پہلے مصرعے میں مناسب الفاظ کے ذریعے خیال کے بارے میں معلومات دی جائیں۔دوسرے اور تیسرے مصرعے میں خیال مکمل طور پر پورے زور وشعور کے ساتھ ڈرامائی انداز میں پیش کیا جائے کیوں کہ چوتھا مصرعہ ہی رباعی کے مجموعی تاثر اور خلاصے کو بیان کرتا ہے۔اس میں ہی رباعی کا اصل خیال یا مضمون کو بیان کیا جاتا ہے جس کی خاطر رباعی لکھی گئی ہے۔

جہاں تک رباعی کے مضامین اور موضوعات کا تعلق ہے۔اس صنف کا آغاز مذہبی مضامین کے بیان سے ہوا۔شروع شروع میں حمد، نعت اور توحید کا ذکر ہی رباعی میں کیا جاتا تھا۔پھر آہستہ آہستہ صوفیانہ خیالات، معرفت کے مضامین رباعی کے موضوعات بن گئے۔صوفیاء کرام کا دین کی تبلیغ کا کام کرنا، لوگوں کو اخلاق کا درس دینا اور معاشرے کی اصلاح یہ سبھی مضامین صوفی شعراء نے رباعی میں بیان کیے۔اگر فارسی رباعی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ابوسعید، ابوالخیر نظامی گنجوی، خواجہ کرمانی اور فریدالدین عطار نے رباعی میں صوفیانہ خیالات لوگوں تک پہنچائے ہیں اور ان کو اخلاقیات کا درس دیا ہے۔اس کے بعد مستی رندی، حکمت اور عشق کے خیالات کو رباعی میں پیش کیا جانے لگا، مزید وقت گزرنے کے ساتھ موجودہ زمانے کے مسائل کو بھی رباعی میں جگہ دی گئی اور اب غزل کی طرح ہر قسم کے

مضامین رُباعی میں بیان کئے جارہے ہیں۔جیسا کہ برطانیہ میں رہائش پذیر شاعر عطا محمد عنبر نے کیا ہے۔

آپ نے مختلف مضامین کو رُباعی صنف میں ''حقانی رباعیات'' کے نام سے اردو ادب کی رُباعی صنف کو امر کرنے کی کوشش کی ہے۔آپ نے جن مضامین پر اس شعری مجموعہ میں اظہار خیال کیا ہے۔اسکا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔اگرچہ عنبر صاحب کی رباعیات میں موضوعات کی رنگارنگی موجود ہے۔مگر زیادہ تر رباعیات میں حمد ونعت کا پہلو نمایاں طور پر پڑھنے کو ملتا ہے۔جو آپ کی مذہب سے وابستگی کو ظاہر کرتی ہے،مگر ایک عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے مسلمان فرقوں میں سے ایک فرقہ کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔جو کہ میرے نزدیک درست نہیں اس لیے کہ شاعر کا کام عوام الناس میں پیار پیدا کرنا ہوتا ہے نہ کہ نفرت،قارئین میں اس مخصوص فرقہ کے لوگ شامل ہوں گے یقیناً وہ ایسی تحریر کو پڑھنا پسند نہیں کریں گے جوان کے مذہبی عقائد کے خلاف ہو۔اس طرح سے عنبر صاحب نے اپنے آپ کو دائرہ قارئین میں محدود کر لیا ہے اور اپنے پر ایسی چھاپ لگالی ہے کہ آئندہ بھی ایسے لوگ آپ کی تحریروں کا مطالعہ نہیں کریں گے۔

دوسری بات جو ایک اچھا شاعر ہونے کے باوجود آپ کو دوسرے شعراء سے الگ کرتی ہے اور آپ کے قارئین کی تعداد میں کمی کی باعث بنتی ہے وہ انتہائی مشکل فارسی نما اردو ہے۔ذخیرہ الفاظ کا ہونا اچھی بات ہے مگر شعر کہتے وقت قارئین کی علمی استعداد کو مدِ نظر رکھا جائے تو ابلاغ کا کام بہت موثر انداز میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔میری سمجھ سے عنبر صاحب کا یہ طرز کلام بالاتر ہے۔کیونکہ پڑھتے ہوئے جا بجا مشکل الفاظ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔اگر آسان الفاظ میں ہی بیان ہوتا تو کتاب کی پذیرائی دوچند ہونا تھی۔

بلاشبہ عنبر صاحب شاعر بہت اچھے ہیں جن کے ہاں موضوعات کی بھرمار ہے۔ذخیرہ الفاظ کشادہ ہونے کی وجہ سے موقع محل کے مطابق الفاظ کے استعمال کا فن بھی جانتے ہیں۔مگر تعریف وہ جو کوئی دوسرا کرے یہاں تو عنبر صاحب اپنی تعریف خود ہی اپنے مُنہ سے کر رہے تھے۔کچھ مثالیں یوں ہیں:

یاں عمر خیام آئے رُباعی مری دیکھے
آئے تو رباعی پہ رُباعی مری دیکھے
لکھتا ہوں عجب رنگ میں ہر ایک رُباعی
وہ رنگ ہے ایسی لکھائی مری دیکھے(ص 3 3 3)

کیا خوب رباعی پہ رباعی ہے عطا
مصرع کی گرہ خوب لگائی ہے عطا
کوزے میں سمندر کو کیا بند کہ واہ
اسلام کی یوں جوت جگائی ہے عطا(ص 2 2 2)

عنبر کے اشعارہ مضامین نرالے
ان میں کوئی نون کوئی میخ نکالے
عنبر کے اشعار میں دم خم بھی نیا ہے
معنی میں ہم رنگ ہیں اشعار نرالے(ص 4 0 8)

اگر چہ اس مجموعہ کلام میں آپ نے شروع میں حمد باری تعالی بیان نہیں کی۔مگر پوری کتاب میں آپ باری تعالی کی مدح سرائی کرتے نظر آتے ہیں۔آپ اللہ تعالی کی ہر صفت کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔اس سے آپ کی عاجزی کا پتہ بھی چلتا ہے۔کہتے ہیں کہ اللہ مختار ہے قہار ہے جبار ہے اور اس دنیا میں اسی کا حکم چلتا ہے۔

اللہ ہی مکون ہے تو مختار ہے اللہ
جو چاہے وہی کرتا ہے قہار ہے اللہ
اُس روز اُگل دے گی ہر اک راز یہ دھرتی
حکم اللہ کا چلتا ہے کہ جبار ہے اللہ(ص 1 7)

اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ بھی ایک ہے اور وہ اکبر ہے۔

اللہ ہے احد اللہ سب سے جدا ہے
احمدؐ کا محمدؐ کا احد رب عُلا ہے
اکبر ہے وہ اکبر ہے وہ اکبر ہے وہ اکبر
تکبیر و تکبر کا سزاوار خُدا ہے(ص 9 1 4)

اگر چہ پوری کتاب میں جا بجا عاشق رسول ﷺ میں ڈوبی رباعیات آپکے عشق رسول کی

گواہی دے رہی ہیں۔مگر اس رباعی میں آپ کا عشق رسول ﷺ عروج پر دکھائی دیتا ہے۔

رہ نما محمدؐ ہے یہ مصطفیٰ محمدؐ
نام اس کا احمدؐ بھی تو مرتضیٰ محمدؐ
مثل ہو محمدؐ کی کہیں نہیں نہیں ہے
بے مثل احمدؐ ہے تو مجتبیٰ محمدؐ(ص 450)

عنبر صاحب نے کئی رباعیات میں منقبت بھی بیان کی ہے۔آپ کا انداز بیان ایسا ہے کہ عقیدت ومحبت کے علاوہ تاریخ نگاری بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔پھر آپ نے انداز بیان ایسا بنایا کہ مذکور شخصیت کی ظاہری وباطنی خوبیاں کھل کر سامنے آگئی ہیں حضرت سلیمانؑ کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

اللہ نے سلیماںؑ پہ بہت فضل کیا تھا
اللہ نے سلیماںؑ کو عجب علم دیا تھا
ہر ایک پرندے کو سمجھتا تھا وہ بولی
اللہ نے عجب تخت رواں اس کو دیا تھا(ص 302)

کہتے ہیں کہ حضرت مریمؑ جیسی ماں اور حضرت عیسیٰؑ جیسا بیٹا اس دنیا میں کوئی نہیں۔

توہین ہے یہ عیسیٰؑ دوراں نہیں کوئی
پر عیسیٰ کی مانند تو پسراں نہیں کوئی
تشبیہہ کسی کو نہ دو مریمؑ کے پسر سے
ہاں عیسیٰؑ کی مانند تو پسراں نہیں کوئی(ص 98)

حضرت خدیجۃ الکبریٰ اُمت کی ماں ہیں۔زوجہ نبی ﷺ کی کوئی مثال اس دنیا میں نہیں۔

کیا بات ہے خدیجہؑ کی ہے وہ اُم یقیں ہے
اُس جیسی کوئی ماں بھی کوئی ماں ہی نہیں ہے
امت کی ہے وہ ماں کہ وہ زوجہ نبیؐ کی
اور ایسی کہیں ماں تو کوئی اور نہیں ہے(ص 126)

امام حسینؑ نے حق کے لیے جان راہ حق میں قربان کی۔

کربل میں حسینؑ ابن علیؑ کا کنبہ
کنبہ وہ رسولؐ عربی کا کنبہ
ایمان پہ دی جان سبھی نے عنبر
کیا خوب محمدؐ سے نبی کا کنبہ(ص 9 4)

آپ نے تاریخ اسلام کے بہت سارے واقعات کو رباعیات میں پیش کیا ہے۔اس سے آپکی تاریخ بینی کا پتہ چلتا ہے۔اشعار کے ساتھ تاریخی واقعات کو رباعیات میں پیش کیا ہے۔اس سے آپکی تاریخ بینی کا پتہ چلتا ہے۔اشعار کے ساتھ تاریخی واقعات کو اشعار میں بیان کرنا مشکل کام ہے۔یہ کام عنبر جیسا کہنہ مشق شاعر ہی کرسکتا ہے۔حضرت یوسفؑ کو مصر کی بادشاہی کیسے ملی۔اس واقع کا یوں بیان کیا ہے:

یعقوبؑ کے بیٹے کو ملا مصر کا تخت
یوسفؑ کو نصیب ایسے ہوا مصر کا تخت
یوسفؑ کو مصائب سے گزار گیا وہاں
یوں اللہ نے یوسفؑ کو دیا مصر کا تخت(ص 1 0 6)

حضرت سلیمانؑ وہ جلیل القدر نبی تھے۔جن کی حکومت کائنات کی ہر چیز پر تھی۔آپ ہر جانور چرند پرند کی زبان جانتے تھے۔پرندے ہُد ہُد اور آپ کے درمیان جو بات چیت ہوئی۔اس تاریخی واقعہ کو آپ نے تین رباعیات میں بیان کیا ہے۔آخری رباعی میں ملکہ بلقیس کے اسلام قبول کرنے کے واقعہ کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

ہر طرح تھی مظبوط سلیمانؑ کی حکومت
بلقیس پہ بیٹھی تھی سلیمانؑ کی ہیبت
رانی نے پڑھا خط چلی آئی وہ فوراً
پھر دل سے قبول اس نے کی اسلام کی دعوت(ص 3 0 1)

عنبر صاحب کی رُباعیات میں معاشرتی اصلاح کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔وہ دردِدل رکھنے والے شاعر ہیں،کئی رباعیات میں آپ نے نصیحت نگاری بھی کی ہے،مقصد انسانیت کی اصلاح ہے تاکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں سدھار پیدا ہوجائے اور معاشرہ امن وسکون

کیساتھ ترقی کرے۔ کہتے ہیں کہ حسد سے انسان کو کچھ نہیں ملتا۔ اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔

جو بغض جو حسد ہے تم حسد سے رہو دور
ضد اچھی نہیں ہے ایسی ضد سے رہو دور
حاسدِ کو حَسد سے کچھ نہیں ملتا رقیب
ہے زُعم بداں پہ زُعمِ بد سے رہو دور(ص 36)

لوگ جب ایک دوسرے سے حسد سے کرتے ہیں تو انکی عقل ختم ہو جاتی ہے لہذا اس سے بچنا چاہیے۔

شاعر ہیں ادیب ہیں بلا کے ہیں فہیم
ڈاکو یہ نہیں ہیں پھر لُٹیرے نہ غنیم
اک دوجے سے کرتے ہیں حسد کیوں یہ زعیم
مت ماری حسد نے کھو گئی عقل سلیم(ص 34)

کہتے ہیں اللہ کا حکم ہر جگہ چلتا ہے۔ لہذا بندوں اسکی بندگی کرنی چاہیے۔ اور انسانوں یہ وظیفہ ہر وقت کرتے رہنا چاہیے۔

حکم اللہ کا چلتا ہے سمجھ جائے یہ بندہ
جو چاہے وہ کرتا ہے سمجھ جائے یہ بندہ
بندوں کے لیے خاص ہے یہ اکسیر وظیفہ
لاحول ولا قوت الا باللہ(ص 50)

یہ وظیفہ کرنے سے انسان جہنم کی آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

گر چاہے جہنم کی ہوا کھائے نہ بندہ
اللہ کے احد ہونے پر اترائے نہ بندہ
ڈالے نہ گلے خود کے یہ شیطان کا پھندہ
طاغوت کے بردا نہ بنے رب کا یہ بندہ(ص 37)

کہتے ہیں کہ اللہ کو توبہ سے بڑھ کر کوئی شے عزیز نہیں ہے۔

کیونکہ ہے بندوں کی اکڑ شیطان سے بڑھ کر

کیا لینا ہے بندوں نے اللہ سے لڑ کر
بندہ توبہ ہے تو کرو توبہ گنہ سے
اللہ کو کوئی شے نہیں توبہ سے بڑھ کر(ص 4 5 3)

موت کی حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

اللہ کے سوا موت نہ چھوڑے گی کسی کو
اللہ نے کہا موت نہ چھوڑے گی کسی کو
ہر جان کو مرنا ہے ہر اک جان مرے گی
کون اس سے چھپا موت نہ چھوڑے گی کسی کو(ص243)

کہا جاتا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر وقت پاکی حالت میں رہو، ناپاکی سے بچو اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتے رہو۔

نصف ایمان صفائی ہے صفائی پہ مرو
پاک اللہ کی ہر وقت بیاں پاکی کرو
شرک ایسی نجس شے ہے بچو شرک سے اب
اس رجس کو توحید سے اب پاک کرو(ص 3 4 1)

کسی بھی قسم کی ترقی میں تعلیم کا کردار بہت اہم ہوتا ہے جو قومیں تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ وہ کبھی ترقی نہیں کر پاتیں۔ تعلیم کی اہمیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

تعلیم کے میدان میں جو قوم ہے پیچھے
رکھتا ہے زمانہ تو اسے پاؤں کے نیچے
جس قوم کے قرآں کو پس پشت کیا ہے
صد حیف ترقی کے ہُئے بند دریچے(ص 1 7)

عنبر صاحب کا عصری شعور بہت گہرا ہے، معاشرہ میں پیدا ہونے والی برائیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان برائیوں کو بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آج کا مسلم معاشرہ فرقوں میں بٹ چکا ہے۔ الگ الگ رنگ کا لباس تن زیب کئے ان نام نہاد مذہبی ٹھگوں نے

دین کی عزت داؤ پر لگا رکھی ہے۔

فرقوں کی وجہ سے یہ مسلم کی ہے حالت
خرقوں بنا سے ہے ارے اسکی یہ ذلت
جو رنگ برنگے ہیں لباس ایسے ٹھگوں کے
داؤ پہ چڑھا رکھی ہے یوں دین کی حرمت(ص 42)

ایسے نام نہاد لوگ صرف اپنا مفاد سامنے رکھتے ہیں۔ رعایا کی ان کو کوئی فکر نہیں ہوتی۔

چندے کے لیے کرتے ہیں پر بندھ ہمیشہ
پیٹ اپنے ہی بھرتے ہیں یہ ہر چند ہمیشہ
سورج کی کڑی دھوپ مریدوں کے لیے ہی
باغ اپنے لیے کھائیں یہ گل قند ہمیشہ(ص 260)

اس جہالت کی وجہ سے پوری قوم پریشان ہے۔

خود اپنی حماقت سے پریشاں ہیں مسلماں
حد درجہ جہالت سے پریشاں ہیں مسلماں
یک جان تھی امت تو عدو خوف زدہ تھے
فرقوں کی رقابت سے پریشاں ہیں مسلماں(ص 346)

ملک میں معاشی فرق اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ غریب کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اسے پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا اور امیروں کے کتے عیش کرتے ہیں۔

بٹتی ہے مٹھائی تو کہیں پر ہیں پتاشے
بھوکے ہیں بہت لوگ جو پھرتے ہیں ادا سے
پر بندھ کہیں پر غربا کا نہیں کوئی
ان لوگوں سے اچھے تو امیروں کے ہیں کتے(ص 70)

اس معاشی فرق نے ملک کی امن وامان کی حالت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ آج وطن عزیز میں کہیں دھماکے ہیں تو کہیں اسلحہ چلنے سے لہو بہہ رہا ہے۔ سرمایہ دار یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

چلتی ہیں کہیں گولی کہیں پر ہیں دھماکے
بہتا ہے کہیں کون کہیں گرتے ہین لاشے
سب اسلحے کی دوڑ ہے ہوتی ہے کمائی
زردار جہاں بھر کو دکھاتے ہیں تماشے(ص 9 6)

امن وامان کی صورت حال کیا خراب ہوئی پورا نظام سیاست ومعیشت ہی تباہ ہوگیا۔

بگڑی ہے ہر اک چال کرپشن کا ہے رونا
ہر سمت برا حال کرپشن کا ہے رونا
بد حال ہے اب دنیا کرپشن ہے کرپشن
ہیں مرتشی خوشحال کرپشن کا ہے رونا(ص 1 5 1)

عنبر صاحب کو سماجی برائیوں کے متعلق بات کرنے کا انداز ہی نہیں آتا بلکہ آپ بین الاقوامی حالات وواقعات پر غور فکر کرتے ہیں۔اس کی سب سے بڑی مثال مسئلہ کشمیر ہے۔پاکستان اور بھارت کے درمیان یہ مسئلہ 70 سال سے حل طلب چلا آرہا ہے اور اس مسئلے پر ان کی آپس میں تین جنگیں بھی ہوچکی ہیں۔کہتے ہیں کہ کشمیری مجاہدین کی جدوجہد سے اب وہ دن دور نہیں جب کشمیر میں آزادی کا سورج طلوع ہوگا۔

کشمیری جہاد اب جو کریں گے خوب کریں گے
جی جان سے دشمن سے وہ اب خوب لڑیں گے
آزادی ملے ان کو وہ دن دور نہیں ہے
دشمن کو بھسم کرکے وہ مغلوب کریں گے(ص 2 8 1)

عنبر صاحب نے رباعیات کو خوبصورت بنانے کے لیے کئی محاورات کا استعمال کیا ہے۔اسی طرح سے جہاں رباعیات میں ادبی کو خوبصورتی کا جنم ہویا ہے وہاں کلام میں گہرائی بھی پیدا ہوئی ہے۔کیونکہ محاورات کو موقع محل کے مطابق اشعار میں استعمال وہی شاعر کرسکتا ہے۔جس کو شاعری کے رموز پر اچھی طرح گرفت ہو۔کیونکہ ایسا کرنا سمندر کو کوزے میں بند کرنے والی بات ہے۔یعنی اپنی لمبی چوڑی بات کو مختصر انداز میں اس طرح سے بیان کرنا کہ ابلاغ کا کام بھی موثر ہوا اور شعری حسن متاثر نہ ہو۔چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

شہرت ملے تو سچی ملے جھوٹی نہیں
شہرت بروں کی اچھی نہیں سچی نہیں
جلدی نہ مچاؤ کہ عذاب اچھا نہیں
دال ایسے منافق کی کبھی گلتی نہیں(ص 86)

کہتے ہیں سبھی چور کی داڑھی میں ہے تنکا
اب ایسا نہیں پورا وجود ان کا ہے چھلکا
اب چور مچاتے ہیں بہت شور کہ سرقہ
ایسے میں کہے کون کہ ساتھ نہیں ٹھنکا(ص 163)

کچھ بھی کرو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ بناؤ
شیطان کی خاطر تو تماشہ نہ لگاؤ
فرقوں میں بٹے جاتے ہو کچھ شرم و حیا بھی
ختم اس کو کرو،ختم کرو بھدا اتاؤ(ص 267)

یہ کیسی ترقی ہے ترقی کے پجاری
صد حیف کہاں چرنے گئی عقل تمھاری
کب روکا ترقی سے تمھیں دین ھدیٰ نے
ضد دیں سے ہے شیطان کی سر اپنے بلا لی(ص 276)

دال گلنا، چور کی داڑھی میں تنکا، ڈیڑھ اینٹ کی مسجد، اور عقل چرنا، ایسے محاورات ہیں جو عام زندگی میں استعمال کرتے ہیں اور ان کے معنی ہمیں اچھی طرح سے معلوم ہیں۔

اگر چہ اس شعری مجموعے میں اکثر مقامات پر بہت ہی مشکل زبان استعمال کی گئی ہے، مگر یہ بات خوش آئندہ ہے کہ عنبر صاحب نے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ معاشرتی و سماجی برائیوں کو بے نقاب کیا ہے اور اصلاح معاشرہ کا کام ان کی رباعیات سے لیا ہے۔ یہ خوبصورت شعری مجموعہ رباعی روایت کو اسیر کرتا نظر آتا ہے اور نئے شعراء کرام کے لیے راہنمائی کا کام بھی دے گا۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

''خدائے سخن'' کی نظمیں

نظم کے معنی ''موتیوں کی لڑی'' کے ہیں۔موتیوں کولڑی میں پرونا ہے۔لیکن ادبی اصلاح میں نظم سے مراد اشعار کا وہ مجموعہ ہے جس میں کوئی ایک مرکزی خیال ہوتا ہے۔بہت زیادہ اشعار ہونے کی صورت میں خیال کی درجہ بدرجہ بڑھوتری کو ظاہر کرنے کے لیے اشعار کو مختلف حصوں میں تقسیم کرلیا جاتا ہے تاکہ نظم کے معنی اور مفہوم کو اجاگر کیا جاسکے۔نظم میں ایک خیال یا تصور کو موضوع بنایا جاتا ہے۔نظم میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی صرف خیال کے تسلسل کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

نظم میں موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔اس میں کسی بھی موضوع پر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے موضوع چاہے تاریخی ہو یا جغرافیائی دینی ہو یا دنیاوی،تہذیبی ہو یا ثقافتی،معاشی ہو یا معاشرتی،سیاسی ہو یا مذہبی،قومی ہو یا انقلابی،قدیم ہو یا جدید علمی ہو یا ادبی غرض ہر موضوع اور دنیا کے ہر معاملے،زندگی کے ہر مسئلے اور کائنات کے ہر پہلو پر نظم لکھی جاسکتی ہے۔

موضوع کی طرح نظم کے لیے خاص ہیئت کی پابندی ضروری نہیں جس طرح نظم کا کوئی بھی موضوع منتخب کیا جاسکتا ہے اسی طرح نظم لکھنے کے لیے کوئی بھی ہیئت اختیار کی جاسکتی ہے۔اگرچہ روائیتی طور پر نظم کی کچھ خاص اصناف کے لیے خاص ہیئت مخصوص ہیں۔مگر عام طور پر نظم کے لیے کوئی خاص ہیئت مقرر نہیں کی گئی،یہ بات ہمیں عطا محمد عنبر کی نظموں کی کتاب ''خدائے سخن'' میں دیکھنے کو ملتی ہے۔انہوں نیا پنے اس شعری مجموعہ میں جو نظمیں شامل کی ہیں۔ان کو مختلف ہیئتوں میں لکھا ہے کہیں کہیں نظم کا تاثر پھیکا پڑتا دکھائی دیتا ہیاور غزلیہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔کیونکہ آپ کی بہت ساری نظموں میں سے ایک سے زیادہ مضامین کا بیان ملتا ہے۔مگر زیادہ تر نظموں میں اللہ اور اس کے محبوب کی حمد وثناء کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔اصلاح فرد اور اصلاح معاشرہ کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں۔نظموں میں نصیحت نگاری کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔مگر آپ نے انتہائی مشکل زبان استعمال کر کے اپنے آپ کو ایک خاص مکتب فکر تک محدود کرلیا ہے۔اس وجہ سے کئی اشعار قارئین کی سمجھ سے بالاتر ہوگئے ہیں۔آپ نے جن موضوعات کو نظموں میں بیان کیا ہے۔اس کا فنی وفکری جائزہ کچھ اس طرح سے ہے۔

آپ نے خود اشعار میں مشکل بیان کو تسلیم کیا ہے۔اور اپنے اشعار کو دین ھدیٰ کا پیغام کہا ہے۔اگر وہ یہ پیغام آسان الفاظ میں دیتے تو پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ سکتی تھی۔اشعار کے بارے میں کہتے ہیں:

یہ شاعری نہیں یہ انوکھا کلام ہے
ہر شعر گویا دین ھدیٰ کا پیام ہے(ص 17)

اگر چہ آپ نے کتاب کے آغاز میں باقاعدہ حمد ونعت کو شامل نہیں کیا مگر جا بجا حمد یہ اشعار میں اللہ تعالی کی شان میں رَطبُ اللسان نظر آتے ہیں، کہتے ہیں، آخری نبی کا جو رب ہے وہی عیسیٰ و مریمؑ کا رب بھی ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک اور ذی اقتدار ہے۔

احمد کا رب ہے عیسیٰ مریمؑ کا رب ہے وہ
پاک از عیوب و شرک ہے ذی اقتدار ہے(ص 355)

وہ ہر چیز کا خالق ہے سمندر میں جوار بھاٹا اُسی کے حکم سے آتا ہے۔

خالق ہے رب کل ہی کسوف و خسوف کا
حکم خدا سے بحر میں بھاٹا جوار ہے(ص 376)

آقا کریم ﷺ سے جا بجا اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اکثر اشعار میں وہ عشق رسول ﷺ میں ڈوبتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ جیسا اعلی صفات کا حامل کوئی اور نبی اللہ تعالی نے اس دنیا میں معبوث نہیں فرمایا حالانکہ اعلیٰ سے اعلیٰ پیغمبر دنیا میں آئے۔

پیدا خدا نے دوجا محمدؐ کیا نہیں
خیر الا نام جیسا کہاں سے بشر ملے
احمدؐ رسول جیسا نبی دوسرا نہیں
اعلیٰ سے اعلیٰ دنیا کو پیغام بر ملے(ص 99)

آپ ﷺ کے کردار میں متانت کس قدر تھی اس کو گواہی قرآن دیتا ہے۔

ما ینطق عن الھوی الوحیء پر مدار
بالائے شک شبہ متانت حضور کی(ص 100)

آپ ﷺ کا انداز گفتگو ہر لحاظ سے فصیح وبلیغ تھا۔

احمدؐ کا البیان فصیح و بلیغ ہے
ہر طرح مقرف ہے وضاحت حضور کی(ص 101)

آپ ﷺ کی رسائی عرش معلیٰ تک ہے۔

عرش معلیٰ تک ہے رسائی حضورؐ کی
لوٹے رسول مسند یزداں کو دیکھ کر(ص 300)

لہٰذا ایسی ہستی کی الفاظ میں مدحت کا بیان بہت مشکل ہے۔

لفظوں سے ماورا ہے محمدؐ کی شان خاص
مدحت کی حد تو ہی نہیں بے حد کہی ہے آج(409)

اپنی اس بات کا ثبوت آپ نے نبی پاک ؟ کی ایک حدیث ایک شعر میں بیان کر کے دیا ہے۔

ہے لا نبی بعدی کا فرمان محترم
ایسا تو احترام کسی اور کا نہیں(ص 260)

آپ کا کلام اخلاقیات سے بھرا پڑا ہے۔حمدیہ اور نعتیہ اشعار کے بعد سب سے زیادہ اخلاقیات کا مضمون بیان ہوا ہے۔آپ نے شاعری سے اصلاح معاشرہ کا کام لیا ہے، کہتے ہیں کہ فرد نے اپنے دل کو شرک سے پاک کر لیا اور اسے ابدی سکون مل گیا اور جس نے سنت نبوی پر عمل کیا وہ سرخرو ہوا۔

شرک دریا سے پاک کیا جس نے اپنا قلب
واللہ امن چین سے دل اس کا بھر گیا
ٹالی ہے جس نے بات محمد کی اس پہ حیف
مانی ہے جس نے اُس کا مقدر سنور گیا(ص 129)

جس شخص نے لاحول پڑھ کر توبہ کی اللہ نے اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے۔

لاحول پڑھ کے جس نے بھی توبہ کی دل سے یار
اللہ نے اس کے ہر گنہ جڑ سے مٹا دیا(ص 282)

وہ شخص بہت بے وقوف ہے جس نے توبہ کو کل پر ٹال دیا۔

بیوقوفی ہے بیوقوفی
توبہ کو کل پر ٹال رکھنا(ص 256)

انسان کو احتیاط سے زندگی گزارنے کی نصیحت اس طرح دیتے ہیں۔

عنبر تو اب لگا دے اپنے شعور کو
آگے قدم بڑھاؤ تو مگر پھونک پھونک کر(ص 301)

موت برحق ہے اور اسکا ایک وقت مقرر ہے۔کوئی انسان اپنے وقت سے پہلے نہیں مرتا۔

وقت ایک طے ہے موت کا ہر نفس کے لیے
ہے کون ایسا جو موت سے پہلے مر سکے(ص 404)

اس وقت کے آنے سے پہلے ہمیں وقت کی قدر کرنی چاہیئے۔

قدر کرنا ساعتوں کی
ذہن میں ماہ و سال رکھنا(ص 256)

وقت کی قدر کا بہت خوبصورت استعمال اللہ تعالی کی یاد ہے کہتے ہیں:

سب سے حسین نام ہے اللہ کے مومنو

یاد ان کو جو کرے گا وہ اللہ کا یار ہے(ص 384)

آپ کی ملکی حالات پر گہری نظر ہے امن و امان کی صورت حال ہو یا سیاسی، سیاست دانوں کے کرتوت بیان کرنا ہو یا مذہبی نام نہاد ٹھیکے داروں کے رویے کو، ہر معاملے کو باریک بینی سے دیکھتے ہیں، پھر اشعار میں معاشرہ اور انسان پر پڑنے والے اثرات کو بیان کر دیتے ہیں۔ ملک میں ارباب اقتدار کا لوگوں کے ساتھ کیا رویہ ہوتا ہے۔ اسکو بہت خوبصورتی سے اس شعر میں بیان کرتے ہیں:

ارباب اختیار سمیٹیں حرام مال
پر جا کے واسطے بہانے ہیں عجب عجب(ص 151)

ان لٹیروں کے لیے چودہ اگست کا دن جشن آزادی کا دن ہوتا ہے۔

آزادی مل گئی ہے لٹیروں کو لوٹنے کی
چودہ اگست ان کے لیے جشن کا سبب(ص 151)

یہ لٹیرے دھونس سے منتخب ہوتے ہیں ان کی عادات کتوں سے ملتی ہیں کیونکہ یہ اپنے مفاد کی خاطر کتوں کی طرح لڑتے ہیں اور شریفوں کو یہ تنگ کرتے ہیں۔ جب کسی محنت کش کی فصل پک جاتی ہے تو اس پر وڈیرا قبضہ کر لیتا ہے۔

دھونس ایسی ہے لٹیرے ہی ہوتے ہیں منتخب
ہوتا ہے پھر جو تبصرہ ہر انتخاب پر
خُو ان سے ملتی جلتی ہے کتوں سے دیکھئے
کتوں کی طرح لڑتے ہیں ہڈی کو دیکھ کر
رشوت حلال جان کر لیتے ہیں مرتشی
گویا یہ طنز کرتے ہیں اللہ کی نار پر
ملنے لگیں شریفوں کو بھتے کی پرچیاں
انکار ہو تو وار یہ کرتے ہیں جان پر
محنت کشی سے فصلیں اگاتا ہے نت کسان
قبضہ وڈیرا کرتا ہے نت اس کے دھان پر(ص 182)

کہتے ہیں جس ملک کا صدر وزیر اعظم رشوت خور ہوگا وہاں امن وامان کیسے پیدا ہوگا۔

جس ملک کے صدر ہوں راشی مرتشی
کیسے کریں گے گفتگو امن وامان پر(ص 182)

حالانکہ ہر روز سورج عروج وزوال کی داستان بیان کر رہا ہوتا ہے۔

عنبر ہے مختصر سی کہانی عروج اوج
سورج گواہی دیتا ہے خود کے زوال کی(ص 158)

مگراس کے باوجودلوگ ڈنڈی مارنے سے بازنہیں آتے اور سینے میں کینہ رکھتے ہیں۔

ہر چند ڈنڈی مار کا خانہ خراب ہے
عیار ہے سُنار اگر کیا کرے عیار
سینے میں کینہ مخفی ہے اور منہ میں رام رام
جوتوں سے پیار چھوت ہے کیوں سایہ چمار(ص 172)

ان حالات کو دیکھ کرنئی نسل کوانقلاب کا پیغام بھی دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ اب اٹھو ورنہ تمہاری بے حسی تمہیں لے ڈوبے گی۔اٹھواور حرام خوروں کی مرمت کرو۔

اٹھو ورگرنہ بے حسی لے ڈوبے گی تمہیں
لوگو! حرام خوروں کی درگت بناؤ آپ(ص 151)

ایسے لوگوں کوختم کردو جورعایا کے ٹیکسوں پرعیاشی کرتے ہیں:

سرکار انکی ہے تو لگان ان کو ہیں معاف
ڈالیں یہ رعب بنک پہ قرضے معاف کر
اٹھو جوانو! اب کے بساط ان کی دو لپیٹ
اللہ الحفیظ ہو نعرہ زبان پر(ص 303)

اب تیرے پاس طاقت ہےلہٰذااس گند کوصاف کر۔

راحیل ویر بن کے اٹھ اب صاف کر دے گند
اٹھا اب کہ تیرے پاس تو تیرو کمند ہیں

جہاں تک آپ کے کلام میں فنی خوبیوں کا تعلق ہے۔آپ کا کلام بہت ساری خوبیوں سے بھرا پڑا ہے۔ان میں ایک خوبی محاورات کا استعمال ہے۔آپ نے محاورات کواس طرح اپنے اشعار میں بیان کیا ہے کہ ادبی خوبصورتی کے ساتھ معنیوں میں گہرائی بھی پیدا ہوئی ہےاور یہ کام صرف کہنہ مشق شاعر ہی کرسکتا ہے۔کچھ مثالیں حاضر خدمت ہیں:

سینے میں کینہ مخفی ہے اور منہ میں رام رام
جوتوں سے پیار چھوت ہے کیوں سایہ چمار(ص 172)
کاٹھ کی ہنڈیا چڑھی کب
سینت کر اپنی دال رکھنا(ص 254)

پہچانو لاٹھی والے کی ہوتی ہے بھینس کیوں
عنبر بچا لو جتنے بھی تانی تند ہیں(ص 326)

ان مثالوں میں بغل میں چھری منہ میں رام رام، کاٹھ کی ہنڈیا، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، ایسے محاورات ہیں جو یہاں کے لوگ روزمرہ زندگی میں بولتے ہیں۔ اشعار کی خوبصورتی کے لیے خوبصورت تشبیہہ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اس کی مثال پڑھیے:

عنبر ہے مختصر سی کہانی عروج اوج
سورج گواہی دیتا ہے خود کے زوال کی(ص 158)

آپ نے عربی الفاظ کو بہت خوبصورت انداز میں اشعار کی زینت بتایا ہے۔ پڑھتے ہوئے احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی دوسری زبان کے الفاظ پڑھ رہے ہیں۔ بلکہ روانی میں پڑھ جاتے ہیں۔ چند اک مثال اس طرح سے ہیں:

وما ینطق عن الھویٰ الوحی پر مدار
بالائے شک شبہ، متانت حضورؐ کی
لیس کمثلہ شیٍ، خالق ہے ہر شے کا
وہ نور کا بھی رب ہے وہ پروردگارِ نار
اعلان رب کل لمن الملک قال تام
قہار العلی کو تمام اختیار ہے(ص 380)

مختصر بات یہ ہے کہ عنبر صاحب نے چاہے مشکل اردو زبان میں اشعار لکھے ہیں۔ مگر ان اشعار میں گہرائی بہت ہے۔ فنی خوبیوں سے مالا مال ہے یہ مجموعہ کلام مذہبی شاعری میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ اگرچہ اس میں کہیں کہیں ایک فرقے خلاف تعصب کی بو بھی آتی ہے۔ جو میرے نزدیک اچھی بات نہیں۔ میں اسکی اشاعت پر عنبر صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

سیّد مبارک شاہ کی

''ہم اپنی ذات کے کافر'' پر طائرانہ نظر

سیّد مبارک شاہ کی پہلی کتاب ''جنگل گمان کے'' 1993ء میں منظر عام پر آئی اور اشاعت کے اولین ماہ میں ہی سٹالوں پر دستیاب نہ رہی۔دوسری کتاب 1995ء میں شائع ہوئی جبکہ تیسری کتاب ''مدار نارسائی میں'' 1998ء میں چھپ کر سامنے آئی۔تینوں کتابوں کو اہل ذوق محبت میں عجلت دکھاتے ہوئے۔دکانوں سے اپنی لائبریریوں میں اور اشعار کو اوراق سے اپنے دلوں میں منتقل کر لیا۔سیّد مبارک شاہ کی دوسری کتاب ''ہم اپنی ذات کے کافر'' 1995ء میں چھپ کر اہل ذوق سے داد وصول کر چکی ہے۔یہ کتاب آپ کی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔اس مجموعہ کلام میں (48) غزلیں شامل ہیں۔ان غزلوں کا موضوعاتی جائزہ لینے سے پہلے غزل کی تعریف اور ارتقاء پر روشنی ڈالتا ہوں۔

عربی، فارسی، پنجابی اور اردو کی مشہور و مقبول صنف غزل ہے۔اس صنف میں اتنی دلکشی، جاذبیت اور کھچاؤ موجود ہیکہ ہر دور اور ہر طبقے کے دلوں کی دھڑکن بنی رہی اور زندگی کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی رہی ہے۔لفظ ''غزل'' کے ماخذ کے بارے میں ماہرین زبان و ادب کے درمیان اختلاف رائے موجود ہے۔ایک گروہ کا خیال ہے کہ ''غزل'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی اون کتنا، اون کو تار تار کر کے دھاگہ تیار کرنا کے ہیں۔(1)

جب کہ دوسرے گروہ کا نظریہ ہے کہ عورتوں کے ساتھ بات چیت کرنا، اُن کے حسن و عشق کے بارے میں باتیں کرنا۔

''در لغت حدیث کردن بازناں و معاشقہ با ایشاں است و مغازلہ نیز عشق بازی و محاولہ بازناں است، در اصطلاح عبارت است از ابیاتی چند بر یک وزن و قافیہ کہ بشعر مشتمل بر مضامین معاشقہ و تصویر احوال عشاق و جمال مشعوق۔''(2)

مطلب یہ کہ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے بات چیت کرنا، ان کے ساتھ عشق کرنا، اصطلاح میں غزل ان اشعار کا نام ہے جن میں اک وزن اور قافیہ پایا جاتا ہے۔عاشقوں کا

حال معشوقوں کے حسن کا بیان اور عشقیہ مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔

نور اللغات میں غزل کی تعریف کچھ یوں لکھی ہوئی ہے۔غزل ''(ع،مونث) لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا، اصطلاح میں وہ اشعار جن میں حسن وعشق، وصال وفراق، ذوق واشتیاق، جنون ویاس وغیرہ کی باتیں جو عشق سے متعلق ہوں کہی جائیں۔غزل ہر بحر میں کہی جاتی ہے ہر شعر جداگانہ مضمون کا ہوتا ہے۔''(3)

غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔جس میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔قافیہ سے مراد وہ ہم وزن الفاظ جو غزل کے ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں اپنے ہم آواز اور ہم وزن الفاظ کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔قافیہ ہمیشہ ردیف سے پہلے آتا ہے اور شعر میں موسیقی یا ردھم پیدا کرتا ہے۔ردیف کے لغوی معنی ہیں، سوار کے پیچھے بیٹھنے والا یا پیچھے پیچھے چلنے والا، ردیف ہمیشہ قافیہ کے پیچھے آتی ہے۔اس لئے ردیف کا مطلب ہے کہ وہ الفاظ جو قافیے کے بعد غزل کے ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں استعمال کیے جاتے ہیں۔مگر تبدیل نہیں ہوتے، ردیف سے بھی شعر میں سنگیت کا جنم ہوتا ہے اور اس سے غزل کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔مقطع سے مراد غزل کا وہ آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔

غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہوتا ہے جس میں شاعر اپنی فکر، تخیل یا جذبہ مکمل طور پر بیان کرتا ہے۔اس وجہ سے کچھ نقاد اس صنف کو ''وحشی صنف'' یا منتشر الخیال صنف خیال کرتے ہیں۔کیونکہ اس میں نظم یا مثنوی کی طرح خیالات میں ربط اور تسلسل نہیں ہوتا۔اس کے باوجود غزل کے سارے اشعار ردیف قافیہ کے داخلی دھاگے کے ساتھ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔(4)ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے:

''غزل کا ہر شعر ایک ایسا جزو ہے جو غزل کا حصہ ہونے کے باوجود اس سے جدا بھی ہے۔ہر شعر ایک الگ حیثیت کا حامل ہے۔لیکن اس کے باوصف غزل کے دھاگے سے منسلک بھی ہے۔''(5)

غزل میں موضوعات کی کوئی پابندی نہیں، اس میں حسن وعشق جوانی و بڑھاپا، زمین و آسمان، سماج ومعاشرہ، ریاست وسیاست، علم وفن غرض ہر قسم کے خیالات مختلف اشعار میں بیان کئے

جا سکتے ہیں۔مگر سبھی اشعار کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لیے ایک مخصوص داخلی رنگ،مخصوص جذبے اور احساس کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ اُس وقت ممکن ہوگا جب شاعری زندگی کے سبھی خارج مظاہر کو اپنی ذات اور فکر کا حصّہ بنالے اور شعر لکھتے وقت ان کو اپنی ذات سے الگ نہ کرے۔ بلکہ اس کا انداز آپ بیتی والا ہونا چاہیئے۔شاعر غزل کے ایک شعر میں بڑے سے بڑا اور وسیع سے وسیع خیال پیش کرسکتا ہے،یعنی سمندر کو کوزے میں بند کرلیتا ہے۔اس کے لیے الفاظ کا چناؤ بہت احتیاط سے کرنا پڑتا ہے۔اس سے الفاظ کی قدر و قیمت ظاہر ہونے کے ساتھ میں غزل میں ایجاز و اختصار پیدا ہوتا ہے۔شمیم احمد اس بارے میں لکھتے ہیں:

''غزل میں ایجاز و اختصار ایک ایسا وصف ہے جسے لانے کیلئے شاعر علامتوں، کنایوں، استعاروں،تشبیہوں اور صنائع بدائع جیسے سہاروں سے کام لیتا ہے۔''(6)

غزل کے ہر شعر میں اختصار شعر کی جان اور شاعر کی فنی پختگی کو ظاہر کرتا ہے۔اس سے غزل میں ایمائیت اور رمزیت پیدا ہوتی ہیاور غزل کا حسن نکھر جاتا ہے۔اسی طرح اس سے غزل میں لوچ،نیاپن،وسعت اور موسیقیت بھی پیدا ہوتی ہے۔اردو غزل میں حسرت موہانی،فانی بدایونی،جگر،اثر، اقبال،جوش،حفیظ،فراق،فیض،احمد ندیم قاسمی،فراز،شہزاد احمد،قتیل شفائی اور منیر نیازی نے بہت نام کمایا ہے۔انیسویں صدی کے غزل گو شعراء میں ایک نمایاں نام سید مبارک شاہ بھی ہے۔جن کے اب تک شاعری کے تین مجموعہ کلام کی اشاعت ہوچکی ہے۔آپ کے دوسرے مجموعہ کلام''ہم اپنی ذات کے کافر'' کا موضوعاتی جائزہ کچھ اس طرح سے ہے۔اگرچہ اس مجموعے میں نظمیں بھی شامل ہیں۔مگر یہاں پر بات صرف غزلوں کے بارے میں ہوگی۔آپ کے غزلیہ موضوعات کو رومانوی،معاشرتی اور عصری عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔

معاشرتی پہلو

کسی بھی شاعر کی شاعری میں جاذبیت اور قارئین کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے، کہ اُس شاعر کا نقطہ نظر معاشرتی و عصری مسائل کے بارے میں کیا ہے؟ شاعری میں عوامی پن اُسی وقت وجود میں آئے گا۔جب شاعر اپنے آپ کو معاشرے کا ایک فرد خیال کرے گا۔کیونکہ اس طرح کرنے سے اُسے عوام کی خواہشات،سوچوں اور مسائل کا ادراک ہوگا۔معاشرے کے ایک

فرد کی حیثیت سے ان مسائل کا جب خود سامنے کرے گا۔ تو اُسے معاشرتی مسائل اور معاشرتی سوچ کو اجاگر کرنے کی مدد ملے گی۔ اس طرح سے وہ معاشرتی مسائل اور ان مسائل کے باعث لوگوں کی عادات واطوار پر پڑنے والے اثرات کو بھی اشعار میں بیان کرسکتا ہے۔ ان اثرات کا مجموعی طور پر معاشرت پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ان کو اشعار میں بیان کر کے لوگوں کی توجہ اُن مسائل کی طرف مبذول کرواتا ہے۔ ان کے اچھے یا بُرے نقصانات سے آگاہ کرتا ہے اور لوگوں کو ان مسائل کے حل کی ترغیب دیتا ہے۔ معاشرتی مسائل صرف فرد کو ہی متاثر نہیں کرتے بلکہ یہ معاشرتی ترقی و گراوٹ کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے آج سے کچھ سالوں پہلے معاشرے میں امن وسکون تھا۔ لوگ خواہش کم ہونے کی بناء پر مختلف معاشرتی برائیوں کا شکار نہ تھے، احترام انسانیت عام تھا۔ پیار ومحبت کی فضا میں معاشرتی اقدار سے معاشرے میں ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ اتحاد و یگانگت کی مثالیں اخلاقیات کی بنیادیں بہت مظبوط تھیں۔ اسی بناء پر نظام عدل کی مثالیں آج بھی دی جاتی ہیں۔ مگر اب حالات اس کے برعکس دکھائی دیتے ہیں۔ اس حالت کو بیان کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جو حساس طبعیت اور درد دل رکھتا ہو، نڈر ہو، بات کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو، بڑے ظرف سے لوگوں کی تنقید برداشت کرسکتا ہو، جبر کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔ کیونکہ جب وہ معاشرتی برائیوں کو بیان کرے گا تو اُسے ظالم حکمرانوں کے ظلم وستم اور دہشت کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ کام سید مبارک شاہ جیسا کہنہ مشق شاعر ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ اُس میں مذکورہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ شاہ صاحب کی شاعری میں معاشرتی برائیوں کو کس طرح بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مختصر جائزہ اس طرح سے ہے:

انسان جو اپنے وقتی فائدے کیلئے بلند انسانیت کے مرتبے سے گر چکا ہے اور دوعملی کا شکار ہے۔ اُس کے اصل چہرے پر ایک اور چہرہ ہے جس کی وجہ سے اُس کی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔ تاریکی کا گلہ نہ کر بلکہ اُجالہ دیکھنے کی کوشش کر۔ کیونکہ جب تو آئینہ میں دیکھتا ہے تو آئینہ تجھے بہروپیا روپ پر ملامت کرتا ہے۔

سورج کے ڈوبنے کا نہ اتنا ملال کر
آنکھیں طلوع کر کے اجالا بحال کر
کہتا ہے آئینہ کہ یہ صورت نہیں تری
پھرتا ہے کس کی شکل کو چہرے پر ڈال کر (ص 60)

تو ایسی صورت حال میں دل محبت سے خالی ہو جاتے ہیں مگر چہروں کی شادابی کی بدولت اصلیت کا پتہ نہیں چلتا۔

یہ کیا کہ دل ہوئے جاتے ہیں صحرا
مگر چہروں پہ ویرانی نہیں ہے(ص 148)

انسان کا دل جب محبت سے خالی ہوتا ہے۔تو دنیا داری اُس کے دل میں سما جاتی ہے اور کبھی کبھار تو نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ دولت وشہرت کے گھمنڈ انسان اپنی سوچ میں خدا ہونے کا دعویٰ بھی کر بیٹھتا ہے۔

عین ممکن ہے کہ معیار بشر سے گر کر
اپنی دانست میں انسان خدا ہو جائے(ص 97)

معیار بشریت سے گرنے کی خوبصورت مثال احساس کا ختم ہونا ہے۔جب کسی کی تکلیف کا احساس آپ کے دل سے جاتا رہے گا تو بے حسی جنم لے گی۔

نہ جانے بے حسی کیا چیز ہوگی
کہ جب احساس پتھر ہو گیا ہے(ص 146)

اسی بے حسی سے درد آشنائی ختم ہوتی ہے اور انسان دوسرے کا دل رکھنے کیلئے جو نہی تعریف کرتا ہے۔

تو بھی سخن شناس نہ تھا درد آشنا نہ تھا
تو نے بھی شعر سن کر کے مرے واہ واہ کی(ص 169)

حالانکہ شاعر کو لوگوں کی سوچ کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ سامعین با امر مجبوری بیٹھے اور سنتے ہیں،اندر سے سب اُکتاہٹ کا شکار ہیں۔

کتنی گہری دلچسپی سے لکھنے والا دیکھ رہا ہے
ایسا کھیل کہ جس کے سب کردار بہت اُکتائے ہیں(ص125)

ایسے لوگ معاشرتی مسائل سے تو اکتائے ہیں مگر دنیا چھوڑنا ان کو گوارہ نہیں کیونکہ ان کی سوچ ہے کہ ان کے بعد دنیا کا کیا ہوگا۔

بہت سے لوگ اتنا سوچ کر مرنے سے ڈرتے ہیں
کہ ان کے بعد دنیا کا نہ جانے حال کیا ہوگا(ص 77)

یہ لوگ دنیا کی لوٹ مار میں غرق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

دنیا کی لوٹ مار نے دنیا اجاڑ دی
پل بھر کو آنکھ کیا لگی پروردگار کی (ص 3 7)

ایسے لوگ محنت کش کا لہو تک پی جاتے ہیں۔ سخت مشقت کے بعد بھی انکی تعریف کرنا تو درکنار معاوضہ تک نہیں دیتے۔

ہمارا خون پینا چاہتے ہیں
عناصر ہیں جو جینا چاہتے ہیں
لہو مزدور کا خشک ہو گیا ہے
مگر آجر پسینہ چاہتے ہیں (ص 2 1 1)

پھر انصاف کا قتل ہونا یہ کوئی انہونی بات نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسے لوگ اپنے مفاد کیلئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ شاہ صاحب بڑی خوبصورتی سیا یک محنت کش کی فریاد اللہ کے حضور سوالیہ انداز میں پیش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صبر کے ساتھ زندگی بسر کرنے والوں کو انعام کی بشارت دی ہے۔ یہاں انکے حالات دیکھ کر کہتے ہیں:

آسودگی عمر رواں کیوں نہیں دیتے
جو چیز وہاں دو گے یہاں کیوں نہیں دیتے (ص 5 7)

اس غریبی اور خوف کی فضا میں لوگ جرائم اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دیکھتے ہیں مگر عدالت میں بیان دینے کو تیار نہیں ہوتے۔

انصاف کو مرتے ہوئے دیکھا ہے جنھوں نے
وہ لوگ عدالت میں بیان کیوں نہیں دیتے (ص 5 7)

کیونکہ ان کو پتہ ہے ان کا حال بھی ایسا ہی ہوگا۔

کیا اس سے معتبر بھی شہادت ہے منصفوا
آنکھیں شہید ہو گئیں میرے گواہ کی (ص 8 6 1)

ان لوگوں کو ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔ لوگ جینا چاہتے ہیں مگر کاروان زندگی کو

صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے پھر کہیں نہ کہیں کوئی دھماکہ ہو جاتا ہے۔

دھماکے گونج اٹھیاس بنا پر
ادھر دیکھو یہ جینا چاہتے ہیں(ص 2 1 1)

دھماکہ کیا ہوا پورا شہر اپنے لہو سے سرخ ہو گیا۔

مرے شہر بدن کی ہر گلی میں
مرا اپنا لہو پھیلا ہوا ہے(ص 9 4 1)

شاہ صاحب نے کہا اے اللہ تو لوگوں کو ایک بار موت کیوں نہیں دیتا تاکہ وہ روز مرنے کے عذاب سے چھوٹ جائیں۔

ہر وقت لگا رہتا ہے مرجانے کا دھڑکا
جان دے کے ہمیں اسکی اماں کیوں نہیں دیتے(ص 7 5)

ایسے میں معاشرہ ایک ان دیکھے خوف میں مبتلا رہتا ہے۔کیوں کہ انسان جبر وگھٹن کی حالت میں کوئی کام بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا۔

وہ گوہر معقود یہاں بھی نہ ملا تو
پانی میں یہی خوف اترنے نہیں دیتا
مرضی سے سزا رکھی ہے اس نے تو ہمیں کیوں
مرضی سے خطا کوئی بھی کرنے نہیں دیتا(ص 9 7)

پھر انسان دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنے آپ سے باتیں نہ کرے تو اور کیا کرے۔

طاری ہے کتنی دیر سے یہ خاموشی سنو
جاری ہے اپنے آپ سے یہ گفتگو ابھی(ص 8 9)

یہ خوف دن کی بجائے رات کو بھی آرام کرنے نہیں دیتا کیونکہ لاشعور میں چھپے خوف میں اکثر انسان ایسے مناظر دیکھتا ہے۔

اب کس سے کہوں مجھ کو کیوں نیند نہیں آتی
روتا ہوا دیکھا ہے خوابوں میں خدا میں نے(ص 8 2 1)

یہ خوف اس وقت لاحق ہوتا ہے۔جب انسان عام لوگوں سے ہٹ کر چلتا ہے۔یعنی روایت کی پاسداری نہیں کرتا دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ غلط روایات کی پاسداری بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ کیا جارہا ہے وہ غلط ہے۔

اس زعم کے باعث ہی میں بھیڑ میں شامل ہوں
اک راہ نکالی ہے اوروں سے جُدا میں نے(ص 128)

جب جبر کے باعث معاشرے میں بظاہر سکوت دکھائی دے گا تو جان لیں کہ کوئی انقلاب آنے والا ہے۔اکثر انقلاب کی صورت میں مالی و جانی نقصان ہوتا ہے۔لہذا ایسی حالت کو تبدیل کرنے کا جتن کرنا چاہیے۔

کسی بھی طور سے یارو جمود عافیت توڑو
یہ کیفیت رہے گی تو یقیناً حادثہ ہوگا(ص 78)

یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ جاہل لوگ عبادت کا کام صرف چند مخصوص دنوں کیلئے کرتے ہیں اور پھر اپنے شیطانی کاموں میں مگن ہوجاتے ہیں۔

دس روز تک روا ہے تجھے غم حسین
پھر سال بھر اطاعت شمر و یزید کر(ص 57)

یہ روایت نام نہاد علماء نے ڈالی ہے۔اپنے علم پر فخر کرنے پوچھے گئے سوالات کا جواب ایسے دیتے تھے کہ سوال پوچھنے والا لاجواب ہوجاتا تھا۔

علم رکھنے والوں کا ایک المیہ یہ تھا
بے سوال لوگوں، کو لا جواب کیا کرتے(ص 108)

اسی لیے کہتے ہیں کہ اے لوگو! ان لوگوں کی باتوں پر عمل کرنے کی بجائے خود قرآن پاک کا مطالعہ کرو۔

کرتے ہیں ابن جہل کیوں اس کی وضاحتیں
اپنی زباں سے شرح کلام مجید کر(ص 57)

ایسے لوگ بظاہر اپنے علم وفن کی نمائش کرتے ہیں اور اس کو نام جدیدیت کا دیتے ہیں۔

پیراہن بدن کی یہ تنگی عبث نہیں
یہ مرحلہ ہے میری نمو کی نمود کا(ص 3 3)

جب کوئی ان کے سامنے انکی بات یا نظریات سے لاعلمی کا اظہار کرے تو انکا رویہ ایسا ہوتا ہے۔

مری بے نیازی پہ بے نیاز برس پڑا
ارے نامراد! یہ کیا کہا نہیں چاہیے(ص 2 0 1)

حالانکہ یہی لوگ اپنی باتوں کا یقین دلانے کیلئے اللہ کا نام لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

لیتے ہیں تیرا نام وضاحت کے واسطے
کرتے ہیں اختصار سے تفصیل آرزو(ص 6 5 1)

پرانی اعلیٰ اقدار کو انقلاب نو کا نام دیتے ہیں اور پرانی اقدار میں کچھ نیا اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تجدید کر رہی ہیں قدامت کی جدتیں
ہر انقلاب نو ہے مجدد جمود کا(ص 3 3)

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے لوگ اپنی سوچ بھی نہیں رکھتے بلکہ غیروں کی بات کرتے تھکتے نہیں۔ پرائی سوچ رکھنے والوں کی حالت کچھ ایسی ہی ہوتی ہے:

جاتی نہیں دماغ سے لکنت خیال کی
جب لوگ سوچتے ہیں پرائی زبان میں(ص 9 3)

مگر شاید وہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ انسانی برتری پرائی سوچ سے نہیں بلکہ خالق کے تخلیق کے تصور کو عام کرنے میں ہے۔

اس شرف کے باعث ہی مخلوق میں افضل ہوں
خالق کے تصور کو تخلیق کیا میں نے(ص 8 2 1)

اور لوگوں کے ساتھ رشتے بنانے اور نبھانے میں ہے۔

دوستی کی دولت ہی عمر بھر کمائی ہے
اور ہم بھی دولت پر افتخار کرتے ہیں(ص 1 1 1)

حالانکہ انسان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس دنیا میں تمام قیام عارضی ہے۔ مرنے کے بعد اصل سفر شروع ہوگا۔

مسافر ہو تو اتنا یاد رکھنا بس دم ر خصت
یہ رستے لو ٹ جائیں گے تو آغاز سفر ہوگا(ص 7 6)

انسانی حالت ایسی ہے کہ وہ ساری عمر دوسروں کی نقل اتارتے گزار دیتا ہے۔ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ جن کی نقل اتار رہا ہے۔ ان کا انجام کیا ہوا حالانکہ ان کو چاہیئے تھا کہ وہ یہ کام کرتے۔

تمہیں مار ڈالا تھا جن کے طرز حیات نے
انہیں جا کے شہر قبور میں بھی تو دیکھتے(ص 1 0 1)

کیونکہ ساری عمر خوشبو میں بسا بدن مرنے کے بود تعفن دینا شروع کر دیتا ہے۔

اک عمر کی بسی ہوئی خوشبو نکل گئی
اعلان کر رہا ہے تعفن وجود کا(ص 3 3)

اور پھر ساری عمر کی کمائی کا دن بھی آ گیا۔ اب حقیقت واضح ہو جائے گی۔

روز حساب اجرت کار حیات ہے
یا قرض جاں پہ کوئی تقاضا ہے سُود کا(ص 3 3)

ناصحانہ پہلو

درد دل رکھنے والے شعرا کرام اشعار تفریح طبع کے لیے نہیں لکھتے بلکہ اس میں اصلاح انسانیت کی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ مُلا کی واعظ غور سے نہیں سنتے۔ کیونکہ وہ اس کام کو ان کا پیشہ قرار دیتے ہیں۔ مگر جب یہی کام کائی شاعر کرے تو اشعار کو غور سے سنتے ہیں، سمجھتے ہیں اور اس کی تشریح اپنے اپنے انداز میں لوگوں کی بھلائی کی خاطر کرتے ہیں۔ یہ خوبی شاہ صاحب کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یوں تو کہا جاتا ہے کہ خدا کا وجود ہر جگہ پر ہے۔ اس لیے کہ اس کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ مگر شاہ صاحب اپنی شاعری کیلئے اس کے وجود کو ضروری قرار دیتے ہیں تا کہ اسکی رحمت و فضل ہر حال میں شامل حال رہے۔

خدا اس واسطے بھی ہے ضروری
کہ اس کے دم سے میری شاعری ہے(ص 1 5 1)

اسی کی تلاش میں انسان کبھی طواف کعبہ کرتا ہے اور کبھی بوسہ اسود لیتا ہے۔

یہ طوافِ کعبہ، یہ بوسہ سنگ سیاہ کا
یہ تلاش کس کی ہے پتھروں کے حجاب میں (ص 80)

اس لیے انسان کو عاجزی میں رہنا چاہیے تاکہ اسکا فضل ملتا رہے۔ انسان معاشرے میں چاہیے قابل عزت ہو مگر اس کے اندر کی حالت کو وہی جانتا ہے۔

ہزار معتبر سہی جہان کی نگاہ میں
میں کتنا شرمسار ہوں خود اپنی بارگاہ میں
تو آپ بھی نہ گن سکے کہ تیرے کتنے روپ ہیں
کبھی تو خود آکے دیکھ اپنی جلوہ گاہ میں (ص 129)

ایسے میں انسان کو اپنا محاسبہ بھی کرتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے گمراہ ہونے کے امکانات معدوم موجود ہوتے ہیں۔

وہ ترک آرزہ کا مرحلہ بھی طے ہوا آخر
جو سب سے جاں گُسل حصہ صراط جستجو کا تھا (ص 34)

کیونکہ جو لوگ اپنی ذات کا محاسبہ نہیں کرتے ان کو کوئی حق نہیں کہ وہ دوسرے افراد کے اعمال پر تنقید کریں۔

جب محاسبہ اپنے شوق کا نہ کر پائے
پھر کسی کی آنکھوں کا احتساب کیا کرتے (ص 107)

معاشرہ میں ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ جب لوگ خدائی کے دعوے دار بن جائیں تو وہاں سے اصل خدا کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اس کیلئے ہر فرد اپنے ذاتی مفاد کیلئے تاویلایں پیش کرتا ہے۔

ہو خداؤں کا تسلط جس جگہ
اس علاقے میں خُدا نہیں ہوتا (ص 171)

اور اپنے تسلط کو طویل دینے کیلئے ہم کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کا نام بھی استعمال کرنا تو گریزاں نہیں ہونگے۔

خدا سے ہم کو ورثے میں ملی ہے
قسم کھانے کی عادت ہو گئی ہے(ص 2 5 1)

لہٰذا کائنات کو تسخیر کرنا چاہیئے، کیونکہ جلالت، خود پرستی اور تکبر سے انسان گمراہ ہوتا ہے اور انسانیت کا بدنام کرتا ہے۔

جسے معبود کہتے ہیں اُسے تسخیر کیا کرنا
وگرنہ تو اطاعت سے خدا بھی رام ہو جائے
جلالت، خودپرستی، بے نیازی یا تکبر ہو
ترے اوصاف پا کر آدمی بدنام ہو جائے(ص 5 3 1)

لہٰذا ہمت کو اپنا شعار بنانا چاہیے اور کسی چیز کو کھونے کا ملال نہیں ہونا چاہیئے۔

سورج کے ڈوبنے کا نہ اتنا ملال کر
آنکھیں طلوع کرکے اجالا بحال کر(ص 0 6)

ہمت سے اگر انسان کام لے تو اُسے مشکل میں بھی راحت ملے گی۔ کیونکہ مشکل حالات کو انسان اپنی ہمت سے ہی بدل سکتا ہے۔

جو کشید کرنے کا حوصلہ ہے تو کیجئے
کہ ہزار طرح کی راحتیں ہیں عذاب میں(ص 0 8)

کیونکہ کسی اونچے مقام تک انسان اپنی لگن اور مسلسل محنت سے ہی پہنچتا ہے۔

پر تو ہوا میں رہ گئے اول اڑان میں
پہنچا ہوں میں اس مقام تک اپنے ہی دھیان میں(ص38)

جب انسان اپنے دھیان سے اڑان بھرے گا تو اسے مظاہر قدرت اپنا سرمایہ معلوم ہونگے۔

اس دنیا میں ہم جیسے زردار کس نے دیکھے ہیں
دھرتی، سورج، چاند، ستارے سب اپنے سرمائے ہیں(ص 5 2 1)

تاریخ نگاری

اشعار میں تاریخی واقعات کا بیان بہت ہی مشکل کام ہے۔ کیونکہ جب تک تاریخی

واقعات کواس کے پس منظر میں بیان نہ کیا جائے تو پڑھنے والے کوخاطر خواہ اس واقعہ کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔ پھر واقعات کی ایک طویل تفصیل ہوتی ہے۔اسے دومصرعوں میں وہی شخص بیان کرسکتا ہے جسے تاریخ پرمکمل عبور ہو۔ذخیرہ الفاظ وسیع ہواور تاریخی واقعات کومناسب الفاظ میں بیان کرنے کا انداز بھی آتا ہو۔اس ضمن میں شاہ صاحب نے کچھ تاریخی واقعات کو بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے،جیسے حضرت علیؑ نے جب دشمن کوزیر کیااوردشمن کواپنی موت یقینی نظر آنا شروع ہوئی تو اُس نے آپ کے منہ پرتھوک دیااور یوں کرنے سے بچ گیا۔

حد امکاں سے باہر تھا بظاہر اُس کا بچ جانا
مگر کیا کیجئے دشمن نے ہمارے منہ پہ تھوکا تھا(ص 34)

کہتے ہیں کشش ثقل کا راز سائنس دان نے سیب گرنے پر پایا۔

تفکر ہو تو اک لمحے کی بینائی غنیمت ہے
وگرنہ سیب ٹہنی سے تو پہلے بھی گرا ہو گا(ص 77)

کہتے ہیں کہ ستارے کودیکھ کرحضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ یہی میرا خدا ہے۔اس واقعہ کو یوں شعری روپ دیا ہے۔

تحیر شیوۂ پیغمبری ہے اور پیمبر نے
ستارہ دیکھ کر سوچا کہ شاید یہ خدا ہوگا(ص 77)

رومانوی پہلو

غزل میں رومان کا بیان ابتدائی دور سے ہی ہوتا آرہا ہے کہا جاتا ہے کہ غزل میں محبوب کے حسن و جمال کی تعریف، عاشقوں کا حال، ہجر کی کیفیات کو بیان کیا جاتا ہے۔ پرانے وقتوں میں غزل حرف ان موضوعات کے گرد ہی گھومتی تھی۔زمانہ میں تبدیلی کے ساتھ غزل کے موضوعات بھی بدلتے گئے۔مگراب یہ بھی یہ موضوع غزل کے موضوعات میں سرفہرست ہوتا ہے،شاہ صاحب نے اس موضوع پرکھل کا اظہارسخن کیا ہے۔کئی غزلوں کے اشعار میں رومانوی پہلواجاگر ہوتا ہے کہتے ہیں کہ ہمیں جہان کی کوئی خبرنہیں۔کیونکہ سارے جہان میں آپ جیسا کوئی نہیں۔

تیرے جہان کی تو کچھ خبر کچھ نہیں مگر
تجھ سا کوئی نہیں ہے ہمارے جہان میں(ص 38)

جب محبوب لاثانی ہوگا تو زندگی کے رنگین ہونے کا جواز بھی اُسی کے دم سے ہوگا اور بے ثباتی کا تصور بھی اُس کی جادوائی شخصیت سے جڑا ہوا ہوگا۔

تمہارے ساتھ دیکھی تھی وگرنہ زندگی ہم کو
نہ تب محسوس ہوتی تھی نہ اب محسوس ہوتی ہے
ہمیں اس بے ثباتی کے تصور کی اذیت بھی
تمہاری جاودانی کے سبب محسوس ہوتی ہے(ص 100)

محبت تو ہوگی سارے زمانے کو بتا دیا مگر محبوب کا اتنا رعب دبدبہ کہ اُسے نہ بتا سکے۔

زمانے بھر کو جتلانا ہمیں تم سے محبت ہے
مگر تم سے نہ کہہ پانا ہمیں تم سے محبت ہے(ص 106)

محبوب کو محبت کا تو نہ کہہ سکے مگر اُسکی بے رخی سے زندگی کو رائیگاں ہوتے ہوئے اور بدگماں ہوتے ہوئے ضرور دیکھا ہے۔

کیا قیامت تھا تمہارا بے رخی سے دیکھنا
ہم نے دیکھا زندگی کو رائیگاں ہوتے ہوئے
ہم یقیں سے ماورا ہو کر جسے سوچا کئے
اُس نے کچھ بھی تو نہ سوچا بدگماں ہوتے ہوئے(ص109)

محبوب چاہے بدگماں ہو جائے مگر اس کے وصل کی خواہش میں اپنے آپ سے بے خبر ہونا چھوڑا نہیں جاتا۔

کسی کے وصل کے رد عمل میں
کوئی خود سے بچھڑتا جا رہا ہے
میں اپنے آپ سے یوں بے خبر ہوں
کہ بس میرا خدا ہی جانتا ہے(ص 147)

محبوب کے وصل کی تمنا چھوڑی نہیں جاتی حالانکہ اُسے چھوڑنے کا فیصلہ بہت مشکل سے کیا۔

انتخاب مشکل ہے پھر بھی چھوڑ کر تجھ کو
جا تری تمنا کو اختیار کرتے ہیں(ص 111)

بڑی کوشش کی کہ ضبط کا بندھن نہ ٹوٹے مگر ایسا نہ ہوسکا۔

لوگ انبار طلب لے کے کھڑے تھے لیکن
ہم سے اک تیری تمنا بھی سنبھالی نہ گئی(ص 74)

جب محبت زمانے بھر میں نشر ہوئی تو دوریاں درمیان حائل ہوگئیں اور جدائی کے لمحات ساری عمر یاد رہے اور انتظار کی کیفیت ابھی تک باقی ہے۔

اتنا تو مجھ کو یاد ہے بچھڑے تھے اُس گھڑی
جب مل رہی تھیں ساعتیں لیل ونہار کی
یہ کیا طلسم ہے کہ زمانے سے گزر گئے
لیکن ڈھلی نہ شام ترے انتظار کی(ص 73)

جدائی کا خوف خیالات پر اس قدر حاوی ہوا کہ اب دوسروں لوگوں کو ملتے ہوئے دیکھ کر یہ کہنا پڑا۔

قریہ ہجر میں ملتے ہوئے لوگو! سوچو
جانے کب کون، کہاں، کس سے جُدا ہو جائے(ص 97)

جبکہ محبوب کا بچھڑنے کے بعد حال کچھ اس طرح سے ہے:

اے مرے فراموش! ترا حال تو یوں ہے
کچھ رکھ کے کہیں جیسے کوئی بُھول گیا ہے(ص 130)

معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کی یہ بھول جیسے شعوری طور پر ہو، کیونکہ اُس نے محبت کرنے سے پہلے اس فوائد سوچ رکھے تھے، بات دنیاداری کی مگر واسطے محبت کے۔

نا تمام رہنے تھے سلسلے محبت کے
اُس نے سوچ رکھے تھے فائدے محبت کے
عہد لے رہا تھا وہ مجھ سے دنیا داری کا
اور دے رہا تھا بس واسطے محبت کے(ص 58)

شاید اُسے معلوم نہ تھا کہ جب ایک بار محبت کا روگ کسی کو لگ جائے تو یہ روگ عارضی نہیں ہوتا دائمی ہوتا ہے۔

دائمی نہیں ہوتی لذت لب و عارض
عارضی نہیں ہوتے عارضے محبت کے(ص 8 5)

اوراب اس دل کی حالت ایسی ہوگئی ہے کہ اس کی ویرانی دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں بھی کبھی محبت کرنے والوں نے پڑاؤ کیا ہو۔

کون دل کی ویرانی دیکھ کہ یہ سمجھے گا
اس جگہ بھی ٹھہرے تھے قافلے محبت کے(ص 6 5)

اس ویرانی کا ایک سبب محبوب کا حسن و جمال ہے۔ جب حسین پری چہرہ دیکھا تو عاشق کو اپنی بصارت چھنتی ہوئی لگی۔

لپکی تھی اک مثل ہی اُس بے نظیر کی
اتنے میں بجھ گئی تھی بصارت بصیر کی(ص 9 5)

اُس کی نگاہ سے نکلنے والے تیر سے مجھے احساس ہوا کہ میں کسی کی نگاہ کا شکار ہوگیا ہوں۔

نکلا کماں سے تیر تو احساس تب ہوا
کچھ کہہ رہی تھیں مجھ سے نگاہیں شکار کی(ص 3 7)

نئی خوبیاں

کسی بھی شاعر کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مذکورہ شاعر کا کلام فنی لحاظ سے کتنا مظبوط ہے۔ مراد اُس نے اپنے خیالات کو عروض شاعری میں کس حد تک نبھانے کا جتن کیا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی غزلیات میں جہاں ردیف وقافیہ کی بندش کو مدنظر رکھا۔ وہیں تشبیہ، استعارہ سے کلام کو خوبصورت بنانے کا جتن کیا ہے۔ علامت نگاری آپ کی شاعری کی ایک اور خوبی ہے۔ حالانکہ علامتوں کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عام قاری شاعری میں مروج علامتی نظام سے واقف نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ علامتوں سے ابلاغ کا کام بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ شاہ صاحب میں معاشرے میں گھٹن کی کیفیت میں کھلتی آنکھ جو معاشرے کا چہرہ دیکھتی ہے۔ اُسے کچھ یوں بیان کیا ہے:

سناٹا گونجتا ہے مکینوں کی یاد میں
پھر آنکھ کھولتی ہیں دڑاریں مکان میں(ص 8 3)

انگڑائی زمیں لیتی ہے بھونچال کی صورت
کم بخت کا گردش سے بدن ٹوٹ رہا ہے(ص 130)

بزرگان دین کا کہنا ہے کہ اللہ انسانی دل کے اندر بستا ہے۔شہ رگ سے بھی قریب ہے۔مگر دکھائی صرف ان کو دیتا ہے جو دل پر نظر رکھتے ہیں۔ورنہ روایت کی پاسداری کیلئے سبھی کعبے کا طواف کرتے چلے جاتے ہیں۔

کبھی اپنے دل کے اندر تجھے دیکھتے تو رکتے
ترے کاخ بے مکیں کا یہ طواف کرنے والے(ص 159)

مدحیہ پہلو

مدح کے اصطلاحی معنی تعریف کرنا کے ہیں۔اردو ادب میں اس کیلئے قصیدہ کی صنف بھی استعمال کی جاتی ہے۔کسی بھی فرد کی تعریف کیلئے اُس کے علم،جسمانی بناوٹ اور معاشرتی رتبے کا مدنظر رکھ کر الفاظ کا چناؤ بہت احتیاط سے کیا جاتا ہے۔

اگر آپ متعلقہ فرد میں وہ خوبیاں بیان کریں جو کہ اس میں نہیں ہیں تو مبالغہ آرائی ہوگی۔جہاں تعریف کیم گئے فرد کی شخصیت مسخ ہوگی،وہیں تعریف کرنے والا بھی لوگوں کے طنز سے بچ نہیں پائے گا۔مگر شاہ صاحب کی مدحیہ شاعری پر نظر ڈالیں تو حقیقت کا گمان ہوتا ہے کیونکہ آپ نے ہر لحاظ سے تعریف شخصیت کو مدنظر رکھ کر کی ہے۔اس تعریف سے متعلقہ شخصیت کے اوصاف کھل کر سامنے آئے ہیں۔جیسے میر تقی میر کا غزل میں مقام کا تعین اس طرح کرتے ہیں:

شہر غزل کو شہر خموشاں نہ جانیے
آواز اس میں گھومتی پھرتی ہے میرؔ کی(ص 59)

آپ مرزا غالب سے متاثر تھے۔اس کا برملا اظہار کرتے ہیں:

مانا کہ میرے شعر میں غالبؔ کا رنگ ہے
میرا بھی رنگ کوئی کلام اسدؔ میں تھا(ص 100)

اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مبارک شاہ کی شاعری فنی وفکری لحاظ سے بہت عمدہ شاعری ہے۔آپ نے زندگی کے ہر پہلو پر کھل کر اظہار خیالات کیا،اظہار خیالات کا انداز ہ اچھوتا اور نیا ہے۔یعنی

موضوعات پرانے ہیں مگر انداز بیان ہم عصر شعراء کرام سے بالکل الگ ہے۔یقیناً اس انداز سے وہ موجودہ دور کے باکمال شاعر ہیں اور انکی شاعری نئی نسل کے شعراء کرام کیلئے راہنمائی کا کام کرتی رہے گی۔

حوالہ جات

1۔ سیّد اختر جعفری ڈاکٹر، پنجابی ادبی صنفاں، پبلشرز ایمپوریم 22 اردو بازار لاہور، 2003، ص 192

2۔ آقائی اصفخانی میرزا جلال الدین، تاریخ ادبیات، ایران، جلد اول تہران، ایران 1949، ص 49

3۔ نیر نورالحسن، نوراللغات، جلد اول، لکھنو، 1929 ص، 583

4۔ سیّد اختر جعفری ڈاکٹر، پنجابی ادبی صنفاں، ص 196

5۔ وزیر آغا ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، 1980، ص 203

6۔ شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، لاہور، س، ن، ص 63

7۔ اشعار کا متن لیا گیا: سیّد مبارک شاہ، ہم اپنی ذات کے کافر، بک ہوم، 46 فرنگ روڈ لاہور، 2014ء

❖❖❖❖❖❖❖❖

طاہرہ انعام کی غزلیات پر ایک نظر

انسانی جذبات واحساسات کو منظوم شکل میں پیش کرنا شاعری کہلاتی ہے اور یہ کام صرف اہل درد اور اہل علم و دانش کی ذہنی معراج ہوتی ہے۔ دراصل فن شاعری ایک ایسا ہنر ہے جس کے ذریعے باکمال لوگ اپنی قلبی کیفیات کا اظہار ایسے پیرائے میں کرتے ہیں جس کو پڑھ کر قاری ایسے محسوس ہو کہ اس کے دلی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے زمانے کے تلخ وشیریں تجربات اور رومانوی باتوں کو اشعار کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کیلئے کسی بھی صنف سخن کو اپنایا جا سکتا ہے۔ دور حاضر میں غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس کا ڈنکا چہار اطراف بجتا دکھائی دیتا ہے۔ اس صنف میں نت نئے تجربات ومشاہدات کے ذریعے کئی نئے باب کھولنے کے روشن امکانات پیدا ہو گئے ہیں تاکہ اس صنف کے نئے دور کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ اس صنف کے تابندہ مستقبل کیلئے کام کرنے والوں میں ایک نام ممتاز شاعرہ طاہرہ انعام کا بھی ہے۔

طاہرہ انعام کی شاعری میں موجودہ کرب ناک حالات اور المیوں کا بیان بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ عشق و وفا میں انسانی جذبات کو مجروح کرنا اور دلی جذبات کو ٹھیس پہنچانا جیسے موضوعات پر بھی خوب لکھا گیا ہے۔ شاعرہ نے یہ سب کچھ اپنے شاعری کے مجموعے ''تراشیدم'' میں لکھا ہے۔ اس مجموعے کلام میں زیادہ غزلیات شامل ہیں مگر چند نظمیں بھی پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ اس مجموعہ کلام کا مختصر فکری جائزہ کچھ اس طرح ہے:

شاعر کسی بھی سماج کا حساس ترین فرد ہوتا ہے ارد گرد پیش آنے والے حالات وواقعات پر اسکی گہری نظر ہوتی ہے۔ عام لوگوں کی نسبت وہ ان حالات وواقعات کا اثر زیادہ قبول کرتا ہے اور ان اثرات کو اشعار کے ذریعے بیان کر کے جہاں اپنا نقطہ نظر قارئین کے سامنے رکھتا ہے وہاں لوگوں کی توجہ ان مسائل ومصائب کی طرف بھی دلاتا ہے۔ جیسے شاعرہ کہتی ہیں کہ معاشرے میں مسائل اس قدر گھمبیر ہو گئے ہیں کہ ہر طرف مایوسی پھیلتی جا رہی ہے، لوگ روشنی کی تلاش میں مگن دکھائی دیتے ہیں۔ مگر وہ جدھر بھی دیکھتے ہیں ان کو اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔

مسافر روشنی کو ڈھونڈتا ہے
نگر میں شام ہوتی جا رہی ہے(ص 125)

اس اندھیرے کو عام کرنے میں مذہبی راہنماؤں کو بڑا ہاتھ ہے۔ان لوگوں نے اپنی ذاتی مفاد کیلئے مذہب کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کر دیا ہے۔لوگوں کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر لڑا رہے ہیں اب سمجھ میں نہیں آتا کہ حق پر کس کی موت ہوئی ہے۔

مرتی رہی سپاہ تو لڑتے رہے فقیہہ
کس موت کو سزا کہوں کس کو بقا لکھوں(ص 28)

اس مجموعہ کلام میں دوسرا بڑا موضوع عشق ومحبت کا بیان ہے۔محبت کا رشتہ بھی کیا خوب نشہ ہے۔جب محبوب کا قرب میسر ہوتا ہے تو وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔

تمھاری قربتوں کے کیف میں یوں وقت رکتا ہے
جہاں کی گود میں جیسے سکوت نیم شب ٹھہرے(ص 29)

اس کی سوچ سے ہی راستے میں اجالا ہو جاتا ہے۔

تم ساتھ تو ہو میری راہوں میں
یہ سوچ اجالا کرتی ہے(ص 139)

اور جب ایسے شخص کی تلاش کا سفر ہو تو پھر اپنے آپ کو نہیں دیکھا جاتا ہے۔

سفر تیری طلب کا ہے یہ ہمدم
تو خود کو سامنے رکھتے نہیں ہیں(ص 120)

پھر اس کے لہجے سے سماعتوں کو قرار ملتا ہے اور اس کو پانے کیلئے اگر سارے اثاثے بھی ہارنے پڑ جائیں تو یہ گھاٹے کا سودا نہ ہوگا۔

پھر اس کے لہجے میں پیار آیا
سماعتوں کو قرار آیا
وہ شخص شہرِ وفا میں ٹھہرا
تو سب اثاثوں کو ہار آیا(ص 118)

وہ شخص جادوئی خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے۔ جہاں سے گزرتا ہے۔ ہر دل میں پیار کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔

وہ سحر گر تھا جہاں سے گزرا
دلوں میں جذبے اتار آیا(ص 9 1 1)

سفر ہجر میں اگر چہ بہت سے کاروان رنگ و بو ہم سفر ہیں مگر محبوب کی یاد۔

ہیں میرے ساتھ کئی کاروان رنگ و بو
کہ تیری یاد کا موسم گلاب جیسا ہے(ص 7 2 1)

محبوب کی یاد میں ڈوبی شامیں بہت کرب ناک ہوتی ہیں۔

تمھاری یاد کا ہر موسم حصار رہتا ہے
یہ انتظار کی شامیں کٹھن گزرتی ہیں(ص 6 8 1)

اور اس کے روٹھنے سے غزلوں کی تازگی ختم ہوگی کیونکہ الفاظ کے معنی ہی بدل گئے۔

تو مجھ سے بدلا تو میرے لفظوں کی باس روٹھی میرے لبوں سے
غزل میں اب تو محبتوں کی خزاں نصیبی کا تذکرہ ہے(ص158)

اس کے باوجود بلند ہمتی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔

شکستہ ہیں مگر سمٹے ہوئے ہیں
ذرا سی ٹھیس پر گرتے نہیں ہیں(ص 1 2 1)

طاہرہ انعام کی غزلیات میں انسانی نفسیات یعنی انسانی رویوں کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ معاشرے میں انسانی رویوں کا بھرپور علم رکھتی ہیں اور ان کو اشعار میں بیان کرنے کی صلاحیت بھی۔ انا پرستی موجودہ دور کا اہم مسئلہ ہے۔

فقط اپنی انا کے معترف ہیں
تمھاری اور مری مشکل یہی ہے(ص 5 4)

جو شخص انا پرستی کا شکار ہو جاتا ہے بعض اوقات اسے بہت زیادہ نقصان کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

وہ شخص شہر انا میں ٹھہرا
تو سب اثاثوں کو ہار آیا(ص 118)

اگر ایسے شخص سے جذبوں کی بات کی جائے مگر وہ درمیان میں اپنی انا کو ضرور لاتا ہے۔

میں نے جذبوں کی بات چھیڑی تھی
وہ مگر بیچ میں انا لایا(ص 100)

ایسے شخص کو بعض اوقات وقت بہت بڑی سزا دیتا ہے۔

گردش وقت سے الجھنے کی
وقت کتنی بڑی سزا لایا(ص 100)

موجودہ دور میں باہمی رشتوں کا احترام ایک طرف رشتوں پر سے اعتماد کا فقدان دکھائی دیتا ہے۔ دراصل اسکی وجہ مفادات پر مبنی رشتوں کا قیام ہے۔ اسی لیے شاعرہ کو کہنا پڑا۔

رشتوں سے جڑے ہیں تو بہت ٹوٹ گئے ہیں
تنہائی میں ہم میں بھی تب و تاب بہت تھی(ص 49)

ایسی فضا کی ترجمانی اس شعر میں بہت خوب انداز میں کی ہے۔

جیسے امید بکھرتی ہے یہاں لمحوں میں
ایسے اشجار سے پتے بھی نہیں جھڑتے ہیں (ص 34)

مختصر بات یہ کہ طاہرہ انعام کی شاعری میں موضوعات کی رنگا رنگی ملتی ہے۔ انکی شاعری میں آپ کو بہت کچھ پڑھنے کو ملے گا۔ مجھے انکی شاعری پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے زندگی کے سب رنگ حسیں ہو کر اسکی شاعری میں جلوہ گر ہوں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

''اعتبار'' میں عصری شعور اور اٹل سچائیاں

اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ اشرف المخلوقات حضرت انسان روز ازل ہی سے کچھ ایسا کرنے کی دُھن میں مصروف عمل ہے کہ وہ لازوال اور غیر فانی بن جائے کہیں یہ خیر و شر کی قوتوں سے نبرد آزما ہے تو کہیں حق کی فتح و نصرت کیلئے کوشاں ہیں۔ کہیں یہ ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے تو کہیں نئے نئے سیاروں کی دریافت میں مگن ہے۔ کہیں یہ اپنی نت نئی تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر حیران کن جہتوں کو متعارف کروا کر اپنا لوہا منوا رہا ہے۔ انہیں جہتوں میں جذبات و احساسات کے اظہار کو خوبصورت ذریعہ الفاظ میں کرنے کو شاعری کہا جاتا ہے۔ شاعر اپنے روزمرہ کے مشاہدات کو اشعار کا جامہ پہنچاتا ہے وہ اپنے خیالات کی پختگی اور جذبوں کی روانی کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے ناہید فراموش صاحبہ اپنے مجموعہ کلام ''اعتبار'' میں کیا ہے۔

''اعتبار'' ناہید فراموش صاحبہ غزلیات اور نظموں کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ اس مضمون میں شاعرہ کی غزلیات میں عصری شعور اور اٹل سچائیوں پر بحث کی جائیگی۔ شاعر سماج کا سب سے حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ معاشرے میں ہونے والے واقعات کا براہ راست سب سے زیادہ اثر اس کی سوچ پر پڑتا ہے۔ یہ اثرات اچھے ہیں یا برے ان الفاظ کی مالا میں پرو کر دوسرے افراد کو بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ دراصل شاعر اپنے اشعار کے ذریعے معاشرے میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لوگوں کی سوچ تبدیل کرنے کی کوشش ہے۔ ناہید صاحبہ نے بھی موجودہ دور کی سماجی، مذہبی، معاشی اور سیاسی صورت حال پر بہت بے باک طریقے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

موجودہ دور کو نفسا نفسی کا دور کہا جاتا ہے۔ ہر طرف خلوص میں کمی، رشتوں میں دوری، عدم اعتمادی، لوگوں کی سوچ میں تبدیلی اور ضمیر فروشی کی باتیں کی جاتی ہیں۔ ناہید صاحبہ کہتی ہے کہ آج رشتوں میں پہلے جیسی اپنائیت اور محبت دکھائی نہیں دیتی۔ اب لوگوں کے درمیان تعلق رسمی سا رہ گیا ہے۔ زیادہ تر تعلق ذاتی مفاد پر بنتے ہیں۔

کہاں ہے رشتوں میں اخلاص کی بات آج کل
اکثر تعلق تو محض نبھانے کے لئے ہیں (ص 68)

کیونکہ اپنوں میں بھی غیروں والی روش نظر آتی ہے۔خلوص کی کمی کے باعث ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی غیر بہت مدت کے بعد ملا ہے۔

اپنوں میں بھی غیروں کی سی روش ہے
شاید کوئی دوست ملا ہے بڑے دنوں کے بعد(ص 30)

ہوا کے تیز جھونکے کی مانند ملنے والوں کے خلوص پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

جو بھی ملا ایسے ملا کیسے ہوا کا تیز جھونکا
اب کسی کے خلوص کا ہم اعتبار نہیں کرتے(ص 619)

لوگ ذاتی مفاد کی خاطر پل بھر میں بدل جاتے ہیں۔

ہے اور ہی میرے جہاں کا انداز
یہاں پل میں لوگ بکتے ہیں(ص 172)

اسی وجہ سے معاشرے میں سچائی کی بجائے جھوٹ کا سکہ چلتا ہے۔

سچ کی قیمت معلوم نہیں ہر کسی کو
یہاں اکثر جھوٹ کے سکے چلتیہیں(ص 172)

ایسی صورت حال میں انصاف کی صورت حال کچھ ایسی ہی ہوگی۔

جو جانتے نہیں رموز و اوقاف کچھ عدل کے
وہ بھی آج کل زمانے کے قاضی ہونے لگے(ص 105)

تمام برائیوں کے بیان کے بعد شاعرہ نے زندگی کی اٹل سچائیوں کو بیان کیا ہے۔زمانہ چاہے جتنا بھی بدل جائے، ہر دور میں اور ہر معاشرے میں ان سچائیوں سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔یہ ایسی باتیں جن سے ہر انسان کو قدم قدم پر سامنا کرنا پڑتا ہے اور کسی صورت بھی وہ ان کو جھٹلا نہیں سکتا۔جیسے اس سچائی سے کوئی باشعور انسان کیونکر انکار کرے گا کہ دنیا فانی ہے اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

یہ ڈھلتی عمر کے سایے کہہ رہے ہیں شاید
اب زندگی کی شام ہونے کو ہے

واحد اک ہستی ہے جس کو فنا نہیں ورنہ
باقی تو ہر شے آخر تمام ہونے کو ہے(ص 56)

اسی بات کا دوسرا انداز کچھ ایسے ہے:

وہی ایک ہستی ہے جس کا وجود ہے دائمی ورنہ
ہم سب تو آخر ہو جانے کے لیے ہیں(ص 68)

ابدیت اسی ذات کو حاصل ہے۔ دنیا کی ہر شے فانی ہے۔

ابدی تو صرف اس واحد کی ذات ہے فراموش
باقی اس جہاں کا ہر سورج ہی ڈھلتا ہے(ص 85)

وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ ہر دن کا اختتام رات پر ہوتا ہے۔

ہر دن کو امر ہے رات کا آنا
زمانے کے سورج وقت سے ڈھلنے لگے(ص 84)

ہر گزرتے لمحے سے انسان اپنی موت کے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔

ہم جتنے بھی گم ہوں دنیا کی رنگینیوں میں
ہر گزرتا لمحہ موت کا نظارہ بجائے جا رہا ہے(ص 101)

موت اٹل ہے لہٰذا زندگی میں رنجشیں بڑھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

کیوں بڑھائیں رنجشیں کچھ حاصل نہیں
موت ہے اٹل بس کچھ اپنا نام بنا گئے(ص 66)

انسان کی بخشش اللہ تعالیٰ کی محبت میں چھپی ہوئی ہے۔

مجھ میں تو کوئی ایسی بات نہیں جو وسیلہ نجات بنے
مگر میرے خدا تیری محبت بہت بڑی ہے(ص 127)

دنیا کی یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ انسانیت سے محروم فرد انسان ہو ہی نہیں سکتا۔

شعور سے بالا ہر مرض کی دوا ہیمومن
جو محروم انسانیت ہو وہ انسان ہی کیا ہے؟(ص 150)

تنہائی موجودہ دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔اکثر تنہا رہ جانے والا شخص پرانی باتوں کو یاد کرتے ہوئے پاگل پن کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

کیا عجب چیز ہے یہ تنہائی بھی
یادوں کا شور کہیں پاگل نہ کر دے(ص 167)

یہ بھی بہت بڑی سچائی ہے کہ انسان فاصلوں کی پیائش تو کر سکتا ہے۔مگر جب دلوں میں فاصلے بڑھتے ہیں تو انکی پیائش ناممکن ہو جاتی ہے۔

فاصلے پیائش کے تو مٹ سکتے ہیں مگر
دلوں کے فاصلوں کو کس نے دیکھا ہے(ص 169)

اس مجموعہ کلام میں کئی مقامات پر شاعرہ اپنے موضوع کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر نظر آتی ہیں۔شاعری پر انکی گرفت ڈھیلی دکھائی دیتی ہے۔بہت سے اشعار کو بیان کرتے وقت انکا ذخیرہ الفاظ ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔اس وجہ سے کئی غزلیات کی ادبی خوبصورتی متاثر ہوئی ہے اور اس وجہ سے شاعرہ کی کئی غزلیات قاری کے ذہن پر کوئی اچھا تاثر قائم نہ کر سکیں۔اس کے باوجود میں محترم ناہید فراموش کو اس مجموعہ کلام کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ انکے قلم میں مزید روانی عطا فرمائے۔اُمید ہے آنے والے وقت میں شاعرہ کی طرف سے اچھی شاعری پڑھنے کو ملے گی۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

ادیب انگلش ٹیچرز کی غزلیات

کتب کو مرتب کرنے کا سلسلہ قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے ایسی کتب کے بے شمار پہلو اور فوائد ہیں۔ پہلی بات کہ کسی خاص موضوع پر بہترین تخلیقات پڑھنے کو ملتی ہیں۔ دوسری بات بہت سارے تخلیق کاروں کے بارے میں معلومات ایک ہی کتاب میں سے مل جاتی ہیں، تیسری بات مرتب کنندہ کے مزاج کے بارے میں پتہ چلا جاتا ہے۔ چوتھی بات وہ تحقیق کار جن کی تخلیق کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہوتا۔ جس کے باعث وہ اپنے کاتم کو شائع کروانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان کی کاوشوں کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک کوشش چوہدری نذیر احمد ارمان نے بھی کی ہے۔ آپ نے پنجاب بھر کے انگریزی پڑھانے والے اساتذہ کرام کی تخلیق کردہ غزلیات میں سے انتخاب کر کے ایک کتاب ادیب انگلش ٹیچرز غزلیات مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں سولہ اساتذہ کرام کی غزلیات کو شامل کیا ہے۔ اس کتاب کے شعری محاسن کچھ اس طرح سے ہیں:

ارمان صاحب نے کتاب کا نام جو تجویز کیا ہے۔ وہ کسی بھی لحاظ سے ادب کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ پہلی نظر میں کتاب پڑھنے والا کتاب کے نام اور سرورق کی تصویر دیکھ کر چونک جاتا ہے۔ بادی النظر میں تصویر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کتاب میں پڑھانے کے طریقہ کار کے بارے میں بتایا گیا ہوگا۔

کتاب کا آغاز حسب روایت حمد باری تعالیٰ سے کیا گیا ہے۔ اگر دنیا کے تمام درخت قلم اور سمندروں کا پانی سیاہی بن جائے تو اس خدا کی تعریف ختم نہیں ہوگی۔

بن جائیں گر قلم دنیا کے ہر شجر سے
سیاہی بنے سمندر پھر سات اور بحر سے
لکھنے لگیں وہ ہر دم تعریف اس خدا کی
ہو جائے سب ختم تعریف پھر بھی باقی
میرا خدا وہی ہے
میرا خدا وہی ہے (ص 16)

نعت نبی پاک ﷺ میں اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے گرتے ہوئے لوگوں کو سہارا دیا اور تڑپتی انسانیت کو امن و وفا کا پیغام دیا۔

گرتے ہوؤں کو دیا سہارا

پسے ہوؤں کو گلے لگایا
درود ان پر سلام ان پر
تڑپتی ہوئی انسانیت کو
پیغام امن و وفا سنایا
درود ان پر سلام ان پر

شاعر معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔وہ معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات سے کسی طور بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا۔معاشرتی برائیوں کو دیکھتا ہے اور ان کے سماج پر پڑنے والے اثرات کو اشعار میں بیان کر دیتا ہے۔اس طرح سے ہمیں شاعر کی سوچ کا علم بھی ہوتا ہے اور افراد کی سوچ کو نکھارنے کا موقع بھی ملتا ہے۔آج کے شعراء کرام نے بہت سی سماجی برائیوں کو اپنے اشعار میں اس انداز سے بیان کیا ہے کہ افراد کو ان میں برائیوں کے خلاف نفرت پیدا ہو اور وہ ان کے خاتمے کے لیے جدوجہد بھی کریں۔آج ہمیں معاشرے میں ہر طرف برائیوں کے باعث اندھیرا چھایا دکھائی دیتا ہے۔کہیں بھی روشنی کی کرن دکھائی نہیں دیتی۔

بہت تیرگی چار سو ہے مگر
نہیں ہے کوئی بھی دیا شہر میں(ص 27)

یہ اندھیرا انسانی سوچوں پر اس قدر غالب آچکا ہے کہ کسی پل سکون نہیں ملتا:

ایسا ڈر لگا ہے اب مجھے اس زندگی کا
دن کاٹنے میں اور رات گزرے ہے کپکپی میں(ص 71)

اسی ڈر کی وجہ سے انسان جنگل میں آ گیا ہے۔

اسی واسطے آ گیا دشت میں
کہ ساحل کا جی نہ لگا شہر میں(ص 27)

اسکی ایک وجہ شہر میں وفا کی قلت بھی ہے۔

چلی ہے اب ایسی ہوا شہر میں
کہ بے گھر ہوئی ہے وفا شہر میں(ص 26)

وفا کیا ختم ہوئی انسان نے چند ٹکوں کے عوض ضمیر کا سودا کر لیا۔

اک لقمے پہ ضمیر کا سودا
کس سوچ میں آج کا بشر ہے(ص 70)

اور جب ایسی صورت حال ہوگی تو ا؟ شنائی اک پل میں ختم ہو جائے گی۔

ایک مدت سے آشنا تھے جو
ایک پل میں ہوئے ہیں بیگانے(ص 4 7)

آشنائی کیا ختم ہوئی رشتوں کا تقدس ہی جاتا رہا۔

رشتوں میں الجھا ہوا یہ بازباں انسان
اپنے ہی رشتوں سے بے زباں کیا جا رہا ہے(ص 6 7)

جب رشتوں میں اعتماد کی کمی ہوئی تو آندھی کے ایک جھونکے نے ہی انسان کو گرا دیا۔

پیار کی دیواروں میں شائستہ اعتماد کی کوئی اینٹ نہ تھی
آندھی کے اک جھونکے سے سارا مکاں لا مکاں ہوا(ص30)

رشتوں کے خاتمے میں انسانی خواہشات کا بڑا ہاتھ ہے انسان اپنی سوچ سے رشتوں کو ختم کر رہا ہے مگر نام موت کا بدنام کر رہا ہے۔

خواہشوں کے سمندر میں ڈوب گیا ہے انساں
موت کو تو ایسے ہی بدنام کیا جا رہا ہے(ص 6 7)

ایسے میں انسانی عزم بھی ختم ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

وہ جو چٹانوں کا سا عزم رکھتے تھے
تقدیر کی چٹان سے الجھے تو الجھا نہ گیا(ص 2 9)

اور پھر انسان گروہوں میں اس قدر تقسیم ہوا کہ منزل ایک ہونے کے باوجود راستہ اپنا اپنا اپنائے ہوئے ہے۔

سب کی منزل ایک ہے لیکن
اپنا اپنا رستہ ہے(ص 0 4)

ایسے میں انسان اگر اپنی ذات تک محدود ہو جائے تو حیرانی والی بات نہیں۔

ہر کوئی سہم کے بیٹھا اپنے بند کمرے میں
جب کہ ظلم کو ظلم سے ہی سیا جا رہا ہے

بعض اشعار میں عالم گیر سچائیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ایسے اٹل حقائق جن کی اہمیت ہر زمانے میں مسلم ہوتی ہیا ور کوئی بھی ذی شعور شخص ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ جیسے یہ دنیا ایک راہ گزر ہے اور انسان یہاں پر مسافر ہیا وراس کا جیون صرف دو پل کا ہے۔

یہ دنیا اک راہ گزر ہے
ہر کوئی یہاں مسافر ہے

پل دو پل کا بس جینا ہے
پل دو پل کی نہ خبر ہے(ص 9 6)

وہی شاخ جھکتی ہے جس کو پھل لگا ہو۔

جھکی رہتی ہے وہ شاخ
جو گود میں رکھتی ہے ثمر ہے(ص 9 6)

یہاں کی خوشیاں اور غم انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔

یہاں کا رونا اور ہنسنا بھی
یہ اپنے اپنے عمل کا اثر ہے(ص 9 6)

جب کوئی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو اپنے بھی اسی وقت ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

افتاد پڑی پہ ساتھ نہ دیں
ایسے لاکھ سہارے دیکھے(ص 1 4)

اس کتاب میں کئی جگہ ایسے اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں۔جن میں نصیحت کا رنگ نمایاں ہے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شعراء کرام درد دل رکھنے والے اور لوگوں کو زندگی میں اچھی باتیں بتانے والے ہیں تا کہ ان کی زندگی میں سکون رہے کہا جاتا ہے کہ انسان اس دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر دنیا میں آنے کا اپنا مقصد بھول جاتا ہے۔ایسے انسان کو یوں کہا گیا ہے۔

سنبھل سنبھل کے چل ساحل
دنیا دلدل دنیا ہی بھنور ہے(ص 0 7)

انسان کوئی نیک کام نہ بھی کرے اگر اللہ کے نام کی تسبیح کرتا ہے تو غالب امکان ہے کہ اللہ اس انسان کی بخشش کر دے گا۔

پڑھتا ہوں جو تسبیح تیرے نام کی ہر روز
بخشش کیلئے میری یہی کام بہت ہے(ص 2 6)

انسان کو ہر حال میں سچ بولنے کی تلقین اس انداز میں کی گئی ہے:

تخت ہو یا سولی ہو
سچائی بیان میں رکھنا(ص 7 3)

کتاب میں جا بجا رومانوی انداز پڑھنے کو ملتا ہے اس انداز کا نمایاں پہلو محبوب کی سراپا نگاری ہے۔محبوب کے رخ کی تعریف اس زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

رخ سے آج ہٹا کر آنچل
پاگل کو تو پاگل کر دے(ص 3 3)

محبوب کے وصل کے بغیر عاشق اپنے آپ کو نامکمل خیال کرتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو محبوب سے کبھی یہ نہ کہا جاتا۔

لے کر باہوں میں تو مجھ کو
میری جان! مکمل کر دے (ص 3 3)

محبوب کی آنکھوں کی تعریف کا یہ انداز پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

اک میں ہی نہیں مرتا تیری آنکھوں پہ مری جاں
چرچا تیری آنکھوں کا سر عام بہت ہے (ص 3 6)

اگر چہ ایسے محبوب کو پانا خوش قسمت لوگوں کا مقدر ہوتا ہے مگر زیادہ ریاضت سے بھی اس کا حصول ممکن ہے۔

پا لیتا ارمان تو اس کو
گر پانے کی ریاضت کرتا (ص 4 3)

ایسے محبوب کو پانے کے لیے کئی بار مجنوں بن کر صحرا صحرا گھومنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ دل کا سکون محبوب کی خوبصورت آنکھیں لوٹ کے لے گئی ہیں۔

بن کے مجنوں یوں صحرا صحرا گھوما ہوں
شاید کہ مل جائیں کہیں وہ جناب سی آنکھیں
لوٹ لے گئی ہیں وہ سکون دل یارو!
بے چین سی کر گئی ہیں وہ بے تا ب سی آنکھیں (ص 4 5)

اسکی تلاش اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر جینا دشوار ہے کیونکہ اسے ہر دعا میں اللہ سے مانگا گیا ہے۔

کیسے میں اس کے بنا جینے کا تصور کر لوں
میری ہر آہ کا ثمر ہے وہ وہی میری بینائی (ص 5 7)

عاشق تو اس کے لئے در بدر بھٹک رہا ہے مگر محبوب کو اس کی خبر نہیں ہے۔

بھٹک رہا ہوں دربدر
مگر تمھیں خبر نہیں (ص 8 7)

بے شمار خوبیوں کے حامل کلام میں بات کرتے ہیں مقامی رومانوی داستانوں کے بیان

کی۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے شعراء کرام کو اپنی دھرتی سے کس قدر پیار ہے۔

ہیر کی بستی سے رانجھے کو ڈھونڈیں گے
یہ کیا سوچ کے یارو آئے پاگل سارے(ص 35)

شعراء کرام کے ہاں الفاظ کا وسیع ذخیرہ دیکھائی دیتا ہے اور ان کے مناسب جگہوں پر استعمال کا فن بھی خوب آتا ہے۔خاص کر ایک لفظ کو ایک شعر میں کئی بار استعمال کر کے شاعری پر اپنی فنی پختگی کا ثبوت دیا ہے کچھ مثالیں اس طرح ہیں:

مان کسی پر مان نہ کر
چارہ گر بے چارے دیکھے(ص 14)

منسوب مجھے کرتے ہیں یہ لوگ بھی تجھ سے
ہے نام میرا تیرے نام سے یہ نام بہت ہے(ص 62)

جو شام سنائی تیرے نام کی میں نے
شمشاد تیرے نام کی وہ اک شام بہت ہے(ص 63)

اس کتاب میں کئی غزلیات ایسی ہیں جن کو پڑھتے ہوئے ذہن میں خود بخود سنگیت کی مدھر تان بجنا شروع ہو جاتی ہے اور پھر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے موسیقی کو سامنے رکھ کر غزل کہی گئی ہو۔مثال کے طور پر:

اک میں ہی نہیں مرتا تیری آنکھوں پہ میری جاں
چرچا تیری آنکھوں کا سرعام بہت ہے(ص 63)

ان غزلوں میں خوبصورت الفاظ اور تراکیب پڑھنے والے کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے،مثال خدمت میں حاضر ہے:

بیٹھے ہیں اس آس پہ یادوں کا کٹورا لے کر
تیری خوشبو محسوس کرنے کو جی چاہتا ہے(ص 59)

آخر میں یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں کہ تمام غزلوں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کے کیا گیا ہے جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی پہلی غزل سے آخری غزل تک برقرار رہتی ہے۔میں اس کی اشاعت پر تمام شعراء کرام کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

''نہیں کوئی مثال اس کی'' پر ایک طائرانہ نظر

جب فیصل آباد میں شعروسخن کا تذکرہ کیا جائے گا۔تو اس میں ایک نیا نام اے۔آرنازش کا ذکر بھی آئے گا۔کیونکہ اس ابھرتے ہوئے شاعر نے اپنی شعری تخلیقات سے اہل علم ودانش میں خود کو بڑی جلدی متعارف کروایا اور اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔جہاں تک انکی شاعری کے موضوعات کا تعلق ہے تو انہوں نے انسانی جذبات واحساسات کا اظہار منظوم پرانے انداز میں کیا ہے۔معاشرتی برائیوں کا بیان عشق وجدائی کی بات سراپا نگاری،آج کے معاشرے کے مسائل کا بیان اورازلی وابدی سچائیوں کا ذکران کے ہاں عام ملتا ہے۔اس کام کیلئے انہوں نے کوخوبصورت اور سادہ الفاظ کا چناؤ کیا اوران کو اشعار کے قالب میں اس طرح ڈھال لیا ہے کہ اشعار کے مفہوم میں گہرائی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ دلکشی پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے قاری توجہ سے آپ کے اشعار پڑھنے پر مجبور ہے۔آپ نے اپنے خیالات کو اپنے مجموعہ کلام ''نہیں کوئی مثال اس کی'' میں بیان کیا ہے۔اس مجموعہ کلام کا مختصر جائزہ کچھ اس طرح ہے۔

ادب کی تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر شاعر نے اپنی شاعری کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کیا ہے۔مسلمان ہونے کے ناطے اس سے اسکا کرم طلب کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔تا کہ کام با آسانی پایہ تکمیل تک پہنچ سکے۔کہتے ہیں اے میرے خالق ارض وسماء جن وبشر،ندیاں وساگر،جنگل و صحرا کا تو مالک ہے۔

اے خالق ارض و سماء سب کچھ تیرا
جن و بشر آب و ہوا سب کچھ تیرا
ندیاں و ساگر تیرا دریا تیرے
جنگل تیرے صحرا تیرا سب کچھ تیرا(ص 16)

نبی کریم ﷺ سے آپ والہانہ محبت کرتے ہیں ،کہتے ہیں کہ میرے ہونٹوں پر آپ ﷺ کی تعریف جاری رہے گی اور جس شخص کو آپ کے در کی غلامی مل جائے اس شخص پر اللہ کی رحمت بھی جاری وساری رہے گی۔

ہونٹوں پہ مرے آپؐ کی مدحت ہی رہے گی
سرکارؐ دو عالم سے محبت ہے رہے گی
جس کو بھی میسر ہے پیغمبرؐ کی غلامی
اس شخص پہ اللہ کی رحمت ہی رہے گی(ص 18)

کہا جاتا ہے کہ باپ کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی ہے۔اللہ اس وقت راضی ہوتا ہے۔جب کسی شخص سے اسکا باپ راضی ہوتا ہے۔جب تک سر پر باپ کا سایہ ہو کڑی دھوپ بھی آپکا کچھ نہیں کر سکتی۔

ہو گیا رحمان راضی اس گھڑی میں دفعتاً
جب مسرت سے ہے چہرہ کھلکھلایا باپ کا
دھوپ تھی نازش کڑی لیکن نہ چبھتی تھی مجھے
میرے سر پر جب تلک قائم تھا سایہ باپ کا(ص 21)

باپ کی ڈانٹ میں بچے کی اصلاح کا عمل پوشیدہ ہوتا ہے۔دنیا میں باپ سے بڑھ کر کوئی ہمدرد اور رہبر نہیں ہے۔

سچ جانیے تو ڈانٹ میں حکمت ہے یقیناً
دنیا میں کوئی باپ سا رہبر نہ ملے گا(ص 30)

نازش کے ہاں جا بجا ازلی و ابدی سچائیوں کا اظہار ملتا ہے۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ انسانی اصلاح چاہتے ہیں کیونکہ ان باتوں کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ انسان اپنی اصلاح کر یتا کہ معاشرے میں ترقی کرے، کہتے ہیں کہ زندگی میں بہتری لانے کیلئے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر کوئی شخص ہمت نہیں کرے گا تو اسے اسکے خوابوں کی تعبیر بھی نہ ملے گی۔

کیسے پائے گا خواب کی تعبیر
جس کی ہمت جواں نہیں ہوگی(ص 36)

اگر امانت میں خیانت کی جائے تو اعتبار ختم ہو جاتا ہے اور اگر معاشرے سے حیاء ختم ہو جائے تو لوگوں کا ایمان جاتا رہتا ہے۔

رہی اگر خیانت، امانت میں جاری
نظر میں کوئی بھی امیں نہ رہے گا
حیاء اٹھی گئی جس پہ خائف ہے نازش
کہ عالم میں ایمان و دیں نہ رہے گا(ص 90)

انسان کو ہوس کا دامن چھوڑنا ہوگا۔کیونکہ اگر نہیں چھوڑے گا تو اسے کبھی بھی دل کا قرار حاصل نہ ہوگا۔

دامن چھوڑ ہوس کا ورنہ
دل کا دامن میلا ہوگا(ص 1000)

وقت بے لگام گھوڑا ہے۔کبھی رکتا نہیں۔یہ بات مرشد نے بتائی اور نازش نے اس کو مان لیا۔

وقت اک بے لگام گھوڑا ہے
بات مرشد نے یہ بتائی ہے(ص 5 1 1)

نازش کا عصری شعور بہت گہرا ہے موجودہ حالات میں جن مسائل کا سامنا انسانوں کو کرنا پڑ رہا ہے۔ان کا گہرا علم رکھتے ہیں اور ان مسائل کو اشعار کی صورت میں بیان کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ آج کے دور میں میرے دیس میں نفرتیں عروج پر ہیں، الفت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔اس وجہ سے سارے لوگ بے سکونی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بس گئیں نفرتیں پیار کے دیس میں
الفتوں کے کہیں سلسلے نہ رہے
چھن گیا کیوں سکوں اب ہر اک شخص کا
اب کسی ہونٹ پر قہقہے نہ رہے(ص 6 7)

ایسی حالت میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہر کوئی لٹیرے کا روپ دھارے ہوئے ہے۔

کس پہ نازش ہم اعتماد کریں
شہر میں ہر کوئی لٹیرا ہے(ص 2 8)

نازش کی شاعری میں رومانوی عنصر بھی نمایا دکھائی دیتا ہے۔اسکا ثبوت انکا محبوب کی تعریف میں رطب اللسان ہونا ہے، کہتے ہیں کہ میرے محبوب کی خوبصورتی سے جہاں روشن ہوتا ہے۔لہٰذا اس پیکر حسن کی بات کرنی چاہیے۔

جن کے دم سے جہاں ہوا روشن
ان کے حسن نظر کی بات کرو(ص 7 5)

اس پری چہرے کے حسن کا کیا کہنا اسے جو بھی دیکھے وہ اسکا شیدائی ہو جاتا ہے۔

کیا ہی پر کیف ترا جلوہ زیبائی ہے
جس کو دیکھا وہ ترے حسن کا شیدائی ہے(ص 1 6)

میں بھی اس پر اسی لیے مرتا ہوں۔

یونہی مرتا نہیں ہوں میں اس پر
وہ حسیں بے حساب ہے مرشد(ص 8 1 1)

اس کے مسکرانے سے میری زندگی میں بہار آ جاتی ہے۔اس کی مسکراہٹ کی دنیا میں کوئی مثال نہیں۔

میری ہستی نکھر آئی اسی رعنا کے رنگوں سے
تبسم جس کی عادت ہے نہیں کوئی مثال اسکی(ص 87)

جب اس قدر تعریف ہوگی تو عشق کا اظہار بھی ہوگا، کہتے ہیں کہ ان کو جس سے محبت ہے اسکی خوبصورتی کی کوئی مثال نہیں اور میرے سینے میں دھڑکنے والا دل اسکی امانت ہے۔

مجھے جس سے محبت ہے نہیں کوئی مثال اسکی
بہت ہی خوبصورت ہے نہیں ہے کوئی مثال اسکی
دھڑکتا ہے جو سینے میں کسی کو دوں نہیں ممکن
یہ دل اسکی امانت ہے نہیں کوئی مثال اسکی(ص 87)

عقل اور عشق میں جنگ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی عقل کی رسائی اس جگہ بالکل نہیں ہوسکتی۔ جہاں عشق پہنچ گیا ہو۔

عقل پہنچی نہیں نہ پہنچے گی
عشق کی جس جگہ رسائی ہے(ص 116)

عشق نے تو نازش کو پوری طرح سے قابو کرلیا اور پھر جیسے ہی محبوب نے چھوڑا۔ ان کو ایسے محسوس ہوا جیسے جسم سے روح پرواز کر رہی ہو۔

پھر یوں ہوا کہ میں سانسوں سے ہاتھ دھو بیٹھا
کسی کے چھوڑ کے جانے کی دیر تھی لوگو(ص 32)

پھر عام لوگوں کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہجر بخیئے ادھیڑ دیتا ہے
پیار نہ کیجئے دہائی ہے(ص 116)

اے۔ آر نازش کی موجودہ شاعری کو سامنے رکھتے ہوئے میں یہ بات آسانی سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس سے کہیں بہتر شاعر ہیں جو ہمیں اس کتاب میں نظر آتے ہیں۔ یہ مرحلہ سر ہونے کے بعد مجھے یقین ہے کہ ان کو اپنی کمی کوتاہیوں کا بھرپور علم ہوگیا ہوگا اور میں توقع رکھتا ہوں کہ آئندہ شاعری کے سفر میں ان کا رویہ بہت محتاط اور اظہار خیال بہتر ہوگا۔ کیونکہ مجھے ان کی صلاحیتوں پر مان ہیا ور میں جانتا ہوں کہ وہ اظہار کے اس سے اچھے کئی طریقوں سے واقف ہیں جسے وہ اپنے آئندہ شعری سفر میں اپنے لیے کارآمد بنائیں گے۔ اے۔ آر نازش کیلئے بہت ساری نیک خواہشات اور دعائیں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

باتیں ''خواب،خوشبو،آئینے'' کی

سماج میں خیالات و جذبات کے اظہار کیلئے بہت سے ذرائع موجود ہیں مگر کئی ذرائع ایسے ہیں جن میں ابلاغ زیادہ موثر نہیں ہے۔جیسا کہ سنگ تراشی اور تصویر کشی ہیں۔کیونکہ ان دونوں ذرائع میں فنکار اور دیکھنے والے کے نقطہ نظر میں بہت زیادہ اختلاف رائے کی گنجائش ہوتی ہے۔ہر کوئی فنکار کی سوچ تک رسائی نہیں رکھتا اس لیے سماج میں ان ذرائع کو کم ہی استعمال میں لایا جاتا ہے۔البتہ شاعری ایسا موثر ذریعہ ہے جس میں شاعر اپنا نقطہ نظر بہت کم الفاظ اور وقت میں دوسروں تک پہنچا سکتا ہے اس لیے ہمیں سماج میں چہار سو شاعری کا راج نظر آتا ہے۔اسی ذریعہ سے محترمہ عظمت فردوس اسوہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنے خیالات کو ''خواب خوشبو آئینے'' کا نام دے کر ادب کو امیر بنانے کی کوشش کی ہے۔

اس مجموعہ کلام میں ایک نعت ،مدح مرشد،مدح غالب و جالب،ایک نظم ''ماں'' قطعات،فردیات اور غزلیات پڑھنے والے کی دلچسپی کا باعث ہیں۔محترمہ اسوہ نے اپنے کلام میں جن موضوعات پر قلم چلائی ہے۔اسکا مختصر جائزہ کچھ اس طرح سے ہے۔

شاعرہ نے شاعری کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اس مجموعہ کلام کو اپنے مرشد کی مدح بیان کر کے شروع کیا ہے۔مگر انہوں نیمدحیہ اشعار پر کوئی موضوع نہیں لکھا۔لکھتی ہیں کہ میرے مرشد نے مجھے سیدھے رستے سے روشناس کیا اور آج میں جو کچھ بھی ہوں اپنے مرشد کی نظر کرم کی بدولت ہوں۔

مجھ کو مرشد نے حق شناس کیا
سیدھے رستے سے روشناس کیا
ان کی نظر کرم ہے بس اسوہ
مجھ سی بندی کو اتنا خاص کیا(ص 1 1)

حضور پاک ﷺ کی ذات اقدس سے آپ کو والہانہ محبت ہے،کہتی ہیں کہ آپ ﷺ کے

در سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا اور میری معاشرے میں عزت کا کارن بھی آپ ﷺ کی ذات سے محبت ہے۔

جو سرورؐ کے در کی سوالی ہوئی
وہ جھولی نہ رحمت سے خالی ہوئی
انہیؐ کی محبت کا فیضان ہے
مری ذات کمتر بھی عالی ہوئی(ص 2 1)

جب میں نے اس در پر کوئی التجا کی تو میرے غم خوار مجھ سے دور ہو گئے۔

ترے در پہ کی التجا جس گھڑی
ہر ایک غم سے میری بحالی ہوئی(ص 2 1)

آپ کی شاعری میں سماجی اصلاح کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ حساس طبیعت کی مالک شاعرہ کا اصل مقصد شاعری برائے شاعری نہیں بلکہ اصلاح معاشرہ بذریعہ شاعری ہے۔ لکھتی ہیں کہ اسی شخص کو منزل ملتی ہے جو سیدھی رہ پر چلتا ہے۔

اسی کو منزل ملتی ہے
سیدھی رہ جو چلتا ہے(ص 4 3)

ہمیشہ محبت سے بات کرنا چاہیئے نفرت میں کچھ نہیں رکھا۔

بات محبت کی کرنا
نفرت میں کیا رکھا ہے(ص 4 3)

اسی لیے شاعرہ خود محبت کی بات کرتی ہیں، نفرت ان کو کسی سے نہیں۔

فقط میرا مسلک محبت رہا
کسی سے بھلا کیسے نفرت کروں(ص 9 1)

لہٰذا ایسے کام کر جاؤ کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اچھے الفاظ میں یاد کریں۔

یہ دنیا تم کو یاد کرے
یوں بیج وفا کے بو جاؤ(ص 9 7)

ایک اور جگہ بڑے گُر کی بات بتائی کہ اگر انسان کی نیت میں کھوٹ نہ ہو تو اسکی تقدیر جلد بدل جاتی ہے۔

نیت میں جو اسوہ نہ اگر کھوٹ کبھی ہو
انسان کی تقدیر بدل جاتی ہے پل میں(ص 111)

شاعرہ نے اپنے کلام میں بہت ساری سچائیوں کو بے نقاب کیا ہے۔جیسے کہا کہ یہ دنیا فانی ہے۔

جب دنیا کو دیکھا اسوہ
ساری دنیا فانی لکھ دی(ص 87)

ماں کا نافرمان کبھی کامیاب نہیں ہوا۔

کب ہوا کامران
جس نے ماں کی نہ مانی(ص 292)

احساس موت سے عاری انسان اکیلا رہ جاتا ہے۔

احساس مروت سے ہو جائے جو عاری پھر
اس شخص کو دنیا میں کوئی اپنا نہیں ملتا(ص 151)

مفلس پر کبھی جوانی نہیں آتی۔کیونکہ اسکی پوری زندگی پیٹ بھرنے کیلئے کمانے میں گزر جاتی ہے۔

کس نے دیکھی یہاں
مفلسوں کی جوانی(ص 292)

جس پر اللہ تعالیٰ نظر کرم کر دیں وہ خوش قسمت ترین انسان ہے۔

ہوئی جس پہ تیرے کرم کی نظر وہ
نظر میں میری وہ سکندر ہے خالق(ص 1022)

ماں کے انمول پیار کے بارے میں ہر ادب اور ہر دور میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا گیا ہے۔شاعرہ کہتی ہیں کہ ماں بہشت کی مانند ہے اس کو دیکھنا حج ہے اور جس نے اسکی عزت کی اس نے

دنیا میں اونچا مقام حاصل کیا۔

تیری تخلیق ، کائنات کا محور
بہشت سے بڑھ کے ہے تیرا پیکر
ہو زیارت تیری تو حج ہو جائے
تو ہے کعبہ مثال سا پیکر
تیری تعظیم جس نے بھی کر لی
ہو گیا وہ اس جہاں کا رہبر(ص 6 9)

شاعرہ کی تخلیق کردہ غزلوں پر غور کیا جائے تو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ آپ حالات حاضرہ سے باخبر ہیں۔ ملک میں سیاسی افراتفری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی امن وامان کی صورت حال ہو یا انصاف کی۔ آپ نے بے باک لہجے میں ان واقعات کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ دور میں انسانی اخلاقیات کی تباہی کی طرف بھی اشارہ کئے ہیں۔ اس سے آپ کے عصری اور سماجی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ لکھتی ہیں کہ زندگی کا سفر طے کرتے ہوئے بہت سے مناظر آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔ اگر موجودہ دور کی بات کی جائے تو حالات کے ہاتھوں ہر شخص کو میں نے پریشان دیکھا۔

عجب زندگی کا سفر دیکھتے ہیں
پریشاں پریشاں بشر دیکھتے ہیں(ص 4 2)

پریشان کیوں نہ ہو جب زمانے سے اخلاص ختم ہو جائے اور اس کی جگہ ہر طرف نفرتوں کا راج ہو۔

جنس اخلاص ہو گی ناپید
ہر طرف نفرتوں کا شر دیکھا(ص 3 4)

ایسی صورت حال میں لوگ سچ کیوں کر بولیں۔

لوگ پھر کیسے سچی بات کریں
سچ کو جب سب نے دار پہ دیکھا(ص 3 4)

انسان مارے خوف کے اپنی ذات تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔

عجب زمانے نے رنگ بدلا ہے
کہ سب مقید ہوئے گھروں میں(ص 9 3)

جب خوف چہروں پر طاری ہوگا تو لالی کہاں سے آئے گی

جدت کا یہ درد نرالا ہے اسوہ
چہروں کے رنگ پیلے ہیں شاداب نہیں(ص 5 7)

اور ایسی صورت حال میں کوئی کسی پر بھروسہ نہیں کرے گا۔

آج کیوں اسوہ یہاں
معتبر آدمی نہیں(ص 5 9)

اس وجہ سے آج کے انسان نے دولت کی خاطر خدا تک کو بھلا دیا۔

بک جاتے ہیں لوگ ہوس کی منڈی میں
زر کی خاطر لوگ خدا کو بھول گئے(ص 1 3)

عشق غزل میں بیان ہونے والا سب سے بڑا موضوع ہے۔کہا جاتا ہے کہ صنف غزل مخصوص ہی محبت کے جذبات بیان کرنے کیلئے وجود میں آئی ہے۔اسوہ صاحبہ نے بڑی مہارت سے اس موضوع کو اپنی غزلوں میں بیان کیا ہے۔لکھتی ہیں کہ جب کوئی عشق میں گرفتار ہوتا ہے تو اسے اپنی تباہی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اے عشق تیری ذات سے وابستہ جب ہوئے
کس کو پتہ کہ کیسے جلے ہیں کہاں جلے(ص 3 7)

عاشق کی جان محبوب کے وصل میں ہوتی ہے ادھر محبوب نے نگاہیں بدلیں ادھر عاشق کے دل کا موسم بدل گیا۔

بدل جاتا ہے ہر موسم
وہ جب نظریں بدلتا ہے(ص 6 0 1)

اسی لیے مشورہ دیتی ہیں۔

کسی سے اسوہ نہ عشق کرنا
نہ دل کو وقف ملال کرنا(ص 9 9)

حالانکہ محبوب روح کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔

روح کی تسکین کا
ہے سب دیدار کا(ص 5 9)

کیوں نہ ہو جب پھول چہرہ محبوب کی خوبصورتی کے سامنے پھولوں کی رنگت پھیکی پڑ جائے۔

پھول پھیکے پڑ گئے
دیکھ کر رخسار کیا(ص 5 9)

مگر اس قدر چاہت کے باوجود زندگی میں غم ہی غم ہیں۔

یار کے فراق میں
زیست وقف غم ہوئی(ص 1 2)

جب اس کی یاد آتی ہے دل خون کے آنسو روتا ہے۔

تمھاری یاد کے لمحے بے حد رلاتے ہیں
مجھے تم دے گئے آنسو عجب تھے حوصلے تیرے(ص 7 7)

اختتام مضمون آپ کی اس دعا پر: اے میرے مولا غم والم کو ختم کر کے دل کے سارے غم بھر دے۔

مری دعا ہے کہ اب تو ٹوٹے
غم والم کی صلیب مولا
تو دل کے سارے ہی زخم بھر دے
کمال کا ہے طبیب مولا(ص 1 9)

❖❖❖❖❖❖❖❖

راکی ولسن کا ''مینارِ محبت''

کائنات میں اشرف المخلوقات ہونے کا شرف صرف انسان کو حاصل ہے تمام مخلوقات میں انسان سب سے زیادہ با اختیار بھی ہے۔احساسات و جذبات بھی سب سے زیادہ انسان ہی رکھتا ہے۔اسی لیے وہ ازل سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا آیا ہے۔کبھی آرٹ،تصاویر،لوک داستانیں اور کبھی شعر وادب کی صورت زبان کا اظہار بہترین ذریعہ ہے۔لفظوں کو ایک خاص انداز میں اپنے خیالات کے اظہار لے لیے استعمال کرنا شاعری ہے۔راکی ولسن نے بھی اپنے خیالات کے اظہار کے لیے خوبصورت الفاظ کا استعمال کیا ہے۔اس لیے اسکی شاعری وخود جذبات کے تحت وجود میں آتی ہے۔

راکی نے رشتو ں ناتوں میں بٹے ہوئے انسان کو اس کی خوشیوں،غموں،امنگوں، آرزوؤں،اُمیدوں،نا امیدوں،رویوں اور ولولوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔اسکی بے ساختہ شاعری فطرت انسانی کی عکاس ہے،وہ موضوعاتی شاعری پر بھی طبع آزمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔انکی شاعری میں متاثر کرنے کی زبردست صلاحیت موجود ہے۔یہ صلاحیت صدق دل اور خلوص نیت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔یہ خلوص نیت ان کے مجموعہ کلام ''مینارِ محبت'' میں محبت بانٹتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔آپ کے اس مجموعہ کلام اجمالی جائزہ کچھ اس طرح سے ہے۔

اگرچہ شاعر نے شاعری کی روایت سے ہٹ کر اس کتا کو شروع کیا ہے۔مگر اس کے باوجود وہ اپنے پروردگار کو بھولے نہیں۔کہتے ہیں کہ ہر شے میں اس ذات باری تعالیٰ کا جلوہ موجود ہے اسی لیے تو کائنات کی ہر شے اس کی خوبصورتی کو دیکھنا چاہتی ہے،آج راکی صاحب جو کچھ بھی ہیں وہ سب اس ذات کی کرم نوازی کی وجہ سے ممکن ہوا ہے:

حسن فطرت کے مظہر ہے تیری شان وجیہہ
تیری دید کی طالب ہر آنکھ شیدائی ہے
ان عنایت کے کہاں تھے قابل ولسن
کرم تو نے کیا تیری ذرہ نوائی ہے(ص 103)

''ماں'' ادب میں ایک ایسا موضوع ہے جس پر دنیا بھر کی زبانوں کے تخلیق کردہ ادب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اولاد کیلئے ماں کی دعا کو ایسے بیان کرتے ہیں:

ہر گام پہ ہو کامرانی
تجھ کو ملے بس شادمانی
میری دعا ہے لعل میرے
لہجے میں تیرے ہو روانی
تجھ کو بلا سے دور رکھے
چھو نہ سکے تجھ کو ناگہانی (ص 29)

دنیا کے ہر معاشرے میں کچھ اٹل سچائیاں ایسی ہیں جن کو کوئی بھی معاشرے میں کبھی بھی جھٹلا سکتا ہے۔ ان سچائیوں کو ہر معاشرے نے نا صرف اپنایا ہے بلکہ ان کو اگلی نسل تک منتقل کرنے کا بندوبست بھی کیا ہے۔ جیسے انسان تو خاک کا پتلا اور کائنات میں اس عظیم رب کی سب سے اعلیٰ اور انمول نشانی ہے۔

ہے ولسن خاک کا پتلا
خداوند کی نشانی ہے (ص 35)

ایسے ہی جو شخص ایماندار ہوگا وہ کسی بھی قسم کی لالچ میں آ کر ضمیر فروشی نہیں کرے گا۔

چند سکوں کی خاطر بکتا
ولسن بے ایمان نہ تھا (ص 46)

کہا جاتا ہے کہ انسان کو منہ سے الفاظ بہت سوچ سمجھ کر نکالنا چاہیئے کیونکہ کمان سے نکلا ہوا تیر اور منہ سے نکلے ہوئے لفظ کبھی واپس نہیں آتے۔ یہ الفاظ ہی ہیں جو آپکی سوچ اور کردار کا تعین کرتے ہیں۔

لفظ آتے نہیں کبھی واپس
جو بھی جس کی زبان سے نکلے (ص 50)

اپنے پڑھنے والوں کو ولسن بہت خوبصورت انداز میں رزق حلال کمانے کی ترغیب دیتے

ہیں۔کہ اس کی بدولت انسان دربدر کی ٹھکروں سے بچ جاتا ہے۔

دربدر ٹھوکروں سے بہتر ہے
رزق اپنا حلال رکھنا تم(ص 7 4)

شاعر معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات کو الفاظ میں بیان کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔راکی ولسن کی یہ خوبی ہے کہ وہ بے باک لہجے میں موجودہ دور کی سماجی،معاشی،سیاسی اور مذہبی برائیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔جیسے وہ کہتے ہیں کہ آج اخلاقی گراوٹ کا کہ حال ہے کہ صدیوں سے قائم بھرم ٹوٹ چکے ہیں۔

جو صدیوں سے ہی قائم تھے
وہی ٹوٹے ہم نے بھرم دیکھے(ص 4 3)

اپنے خدا سے دور ہو کر لوگ تباہ و برباد ہوتے جا رہے ہیں۔

لوگ رب کو بھول کر اپنے جہاں میں
نیست و نابود ہوتے جا رہے ہیں(ص 7 0 1)

معاشی مسئلہ اس قدر الجھ گیا ہے کہ انسان کو روزی روٹی کے علاوہ کسی چیز کی فکر نہیں۔

کچھ اس طرح سے الجھا ہے کاروان زندگی
وقت ہی نہیں ملتا ہمیں سنورنے کا(ص 6 7)

ملک میں امن وامان کی صورت حال اس قدر خراب ہے کہ اب تو اپنے ہی گھر سے ڈر لگتا ہے۔

آسیب ہے یا کوئی ہے بھیانک سایہ
ڈرانے لگا ہے اپنا ہی گھر مجھے(ص 7 6)

ولسن کے خیال میں یہ صورت حال اس لیے پیدا ہوئی کہ گلستان کا باغبان یعنی ہمارے راہنما سیدھے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

بھٹکا ہوا ہے باغبان
ویران تبھی ہے گلستان(ص 5 0 1)

ان رہنماؤں کے طور طریقے تبدیل ہونے سے تمام لوگوں کے چہرے مرجھا گئے۔

رخ جو بدلا ہوا نے
پرندے چہچہانا بھول گئے (ص 1 7)

آپکی شاعری میں رومانوی پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے۔اسکا آغاز وہ اپنے محبوب کی سراپا نگاری بیان کر کے کرتے ہیں۔ان کی سراپا نگاری کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس میں مبالغہ آرائی کم پائی جاتی ہے۔دوسرا شعراء کرام کے ایسے اشعار پڑھ کر خیالی محبوب کا تصور ذہن میں آتا ہے۔جبکہ ولسن کے ہاں محبوب گوشت پوست کا چلتا پھرتا انسان دکھائی دیتا ہے۔انکا محبوب اس قدر خوبصورت ہے کہ جو ایک بار اسے دیکھ لیتا ہے۔اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسکے بدن سے جان نکل رہی ہے۔

چاندنی سا تیرا سراپا ہے
جو بھی دیکھے جان سے نکلے

ایسے محبوب کی زلفیں اس قدر خوبصورت ہے کہ اس سے ستارے روشنی حاصل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

زلف چہرے پہ جیسے گھٹا چھائی ہے
ستاروں نے تیرے حسن سے ضیا پائی ہے(ص 1 0 3)

اس سے دیکھنے سے ولسن صاحب کو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وقت رک گیا ہے۔

جب سے اس شوخ نظر نے دیکھا ہے مجھے
وقت جیسے تھم سا گیا ہے(ص 9 5)

اور جب اس سے چھوا تو ہوش جاتے رہے۔

تیرے ہونٹوں کے لمس میں کیا جادو تھا ولسن
ہوش تک نہ رہا ہمیں سنبھلنے کا(ص 2 6)

تعریف سننا ہر ایک کو اچھا لگتا ہے اس لیے ولسن کی تعریف سن کر وہ اپنے محبوب کے پیار میں گرفتار ہوئے مگر پیار ہوا اور ہجر کی کیفیت نہ ہو ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ہجر کا رنگ بھی آپکی شاعری کا ایک اہم پہلو ہے کہتے ہیں کہ محبوب کے جانے کے بعد بھی ان کے خیالوں میں محبوب کی یادوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔

اس سے کہنا دل کے مندر میں ہم نے
اس کی یادوں کا میلہ لگا رکھا ہے(ص 37)

اسکے جدا ہونے کے بعد شاعر کو اپنا چمن اجڑتا اور ہر سپنا بکھرتا نظر آتا ہے۔

میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
میرے من کا چمن ہی اجڑ گیا
اس کے انتظار میں ولسن
میرا ہر ایک سپنا بکھر گیا(ص 94)

راہِ محبت میں ایسی صورت حال پیدا ہونے کے بعد جینا مشکل ہو جاتا ہے۔

راہ محبت میں چھوڑ گئے ہو تنہا
اب جیئیں بھی تو کس کے لئے(ص 41)

مضمون کا اختتام ولسن صاحب کی طرف قائداعظم اور علامہ اقبال کو پیش کردہ خراج عقیدت پر کرتا ہوں کہتے ہیں ان رہنماؤں نے جو کہا اسے سچ کر دکھایا۔

دونوں نے یہ ملک بنایا
جو بولا سچ کر دکھایا
کیا انہوں نے خوب کمال
قائداعظم اور اقبال

ایسے سچے، باہمت اور نڈر راہنماؤں کی مثال ملنا مشکل ہے۔

پاک وطن کے دونوں راہبر
سچے باہمت اور نڈر
نہیں دونوں کی کوئی مثال
قائداعظم اور اقبال(ص 80)

شاعری کے علاوہ اس مجموعہ کلام میں ایک طویل سلسلہ ان تحریروں کا ہے جو راکی ولسن نے اس کتاب کے بارے میں مختلف لوگوں کی تحریر کروائیں ہیں۔ شاعری ص نمبر (29) سے شروع ہو کر

ص نمبر 108 تک جاتی ہے۔جبکہ کتاب کے بارے میں تحریر ص نمبر 7 سے 28 تک اور ص نمبر 108 سے 126 تک پڑھنے کو ملتی ہیں، یوں کہا جا سکتا ہیکہ آدھی کتاب مختلف لوگوں کے مضامین سے بھری پڑی ہے جو کسی طور بھی مناسب نہیں۔اگر ولسن صاحب کو اپنی شاعری کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے جاننے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ الگ سے ایک کتاب چھاپ لیتے تا کہ پڑھنے والوں کو انکی زندگی اور فن کے ہر پہلو کے بارے میں زیادہ معلومات ہو جاتیں۔مجموعی طور پر اس مجموعہ کلام میں غزلیات کی نسبت نظمیں ہر لحاظ سے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔سادہ الفاظ میں شاعر نے خوبصورت انداز میں موضوعات کو بیان کیا ہے۔میں اسکی اشاعت پر راکی ولسن کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔امید ہے آنے والے وقت میں اور زیادہ اچھی شاعری پڑھنے کو ملے گی۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

عامر خان وسیر کی فردیات

کائنات کے اندر اللہ تعالیٰ نے مختلف صلاحیتوں کے حامل افراد کو پیدا فرمایا ہے۔انہی صلاحیتوں کی بنا پر معاشرے میں ہر شخص کی پہچان اور مقام ومرتبہ ہے۔ ہر انسان کے بات سنانے یا بات کرنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔کوئی دھیمے لہجے میں بات کرتا ہے۔تو کوئی انتہائی جارہانہ لہجے میں دوٹوک الفاظ میں بات کرنے کا عادی ہوتا ہے۔کوئی شخص اپنی بات کی مثالیں دے کر گھما پھرا کر بات کرتا ہے۔انداز کوئی بھی اپنایا جائے مقصد اپنی بات کو دوسرے فرد تک پہنچانا ہوتا ہے۔ ہزاروں لوگوں میں کوئی شخص ایسا بھی ہوتا ہے جس کا بات کرنے کا الگ ہی انداز ہوتا ہے۔ جب وہ گفتگو کرتا ہے تو دھنک کے رنگ بکھیر دیتا ہے۔ باتوں سے خوشبو آتی ہے ایسا ہی ایک شخص "عامر خان وسیر" بھی ہے جو اپنے خوبصورت انداز بیان سے نہ صرف لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالیتا ہے بلکہ مسحور کن باتوں سے کسی کو بور بھی نہیں ہونے دیتا۔

عامر خان وسیر کو اللہ تعالیٰ نے جہاں بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے وہاں ایک صلاحیت شاعری کی بھی بخشی ہے۔ جہاں تک میں نے انکی شاعری پڑھی ہے۔انکی شاعری میں ہر رنگ نظر آتا ہے۔انکی غزلیات،نظموں،قطعات اور فردیات پر مشتمل شاعری ''مجھے مان تجھ سے وفا کا تھا'' کے روپ میں چھپ کر سامنے آئی ہے۔ان کی شاعری کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔اس مضمون فردیات کے موضوعات اور سراپا نگاری پر بحث ہوگی۔

سراپا نگاری شاعری کا ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہر شاعر طبع آزمائی کرتا نظر آتا ہے۔اپنے محبوب کی تعریف کرنا ہر شخص کو اچھا لگتا ہے۔اچھا کیوں نہ لگے کیوں کہ وہ اپنے محبوب کے پیار میں اس قدر ڈوب جاتا ہے کہ اسے اپنے محبوب سے بڑھ کر کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ شاعر محبوب کی سراپا نگاری میں مبالغہ آرائی کچھ زیادہ ہی کر جاتے ہیں۔وسیر صاحب لکھتے ہیں کہ میرے محبوب کے حسن کی بات مت کرو کیونکہ اسے دیکھنے والے ہوش گنوا بیٹھتے ہیں۔

اور اس کے حسن کی بات ہی مت کرنا عامر
دیکھنے والوں کو ہوش کہاں آتی ہے(ص 9 2)

میرا محبوب بہت سندر ہے چنچل ہے۔

کتنا سندر ہے کتنا دلکش ہے
میرا محبوب کتنا چنچل ہے(ص 3 8)

اس کے ہونٹ کھولنے پر پھول بھی شرما جاتے ہیں۔

وہ میرے سامنے جب بے حجاب آتی ہے
ہونٹ کھولے تو پھولوں کو حیا آتی ہے(ص 9 2)

اسکی زلفوں میں کھونا ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان گہری دلدل میں گر جائے۔

اسکی زلفوں میں کھو سا جاتا ہوں
جیسے گہری سی کوئی دلدل ہے(ص 3 8)

ایک بار محبوب نے وسیر صاحب کو غلطی سے چھولیا تو آپکے دل میں ہلچل پیدا ہوگئی۔

اس نے غلطی سے چھو لیا مجھ کو
دل میں کیسی مچی یہ ہلچل ہے(ص 3 8)

پھر کیوں نہ کائنات کی ہر چیز میں اس کا جلوہ دکھائی دے۔

کیا بتاؤں عشق میں کیا کیا دکھائی دیتا ہے
میں جدھر دیکھوں تیرا چہرہ دیکھائی دیتا ہے(ص 3 9)

آپ نے فردیات میں بہت سارے موضوعات کو بیان کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپکی قوت مشاہدہ بہت زبردست ہے اور پھر آپ ہر قسم کے خیالات کو اشعار میں بیان کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ اپنے لئے خدا سے کچھ نہ مانگا، جب بھی مانگا تو محبوب کی تصویر کو سامنے رکھ کر۔

میں نے جب بھی خدا سے کچھ مانگا
تیری تصویر روبرو رکھی(ص 4 0 1)

محبوب نے آپکو زمانے بھر میں رسوا کیا مگر آپ نے۔

میرے قصے سر بازار اچھالے اس نے
جس کا ہر عیب زمانے سے چھپایا میں نے(ص 2 0 1)

صرف یہی نہیں بلکہ اس کا ہر گناہ اپنے سر لیا۔

ہر گناہ اپنے سر لیا عامر
اسکی عزت و آبرو رکھی(ص 105)

آپ نے جس کی خاطر دنیا چھوڑی مگر وہ دنیا کی رونقوں میں اس قدر کھو گیا۔ کہ اسے وسیر کو دیکھنے کی فرصت بھی نہ ملی۔

جس کی خاطر تو دنیا چھوڑ آیا عامر
تجھے دیکھنے وہ اپنے گھر سے نہ نکلا(ص 109)

حالانکہ دعویٰ یہ تھا۔

جو کہتی تھی دنیا چھوڑ دوں گی عامر
میری خاطر تو وہ چائے بھی نہ چھوڑ سکی(ص 108)

اور عامر صاحب اسکی خوشی کے لیے مسکراتے رہے۔

میں اپنے آنسوؤں کو پلکوں میں چھپا لیتا ہوں
وہ میرے سامنے جب مسکرا کے آتی ہے(ص 106)

سب کچھ کرنے کے باوجود محبوب خفا ہے۔

میں اپنے جسم کو روح سے جدا دیکھ رہا ہوں
اس بے وفا کو پھر بھی خفا دیکھ رہا ہوں(ص 103)

عامر کا محبوب اپنی ضد کا پکا ہے۔ جدائی نے برا حال کر دیا مگر پلٹنے کیلئے تیار نہیں۔

جانتا ہوں مجھے چھوڑ کے ادھورا ہے
مگر وہ اپنی بات کا پورا ہے(ص 102)

موجودہ دور میں سماجی برائیوں نے معاشرے میں اس قدر اندھیرا پھیلا رکھا ہے کہ عامر صاحب کو اپنے گھر کا راستہ ہی بھول گیا ہے۔

اندھیرا ہی اندھیرا ہر طرف ہے
میرا گھر نہ جانے کس طرف ہے(ص 107)

اس مجموعہ کلام میں میرے لئے ایک بات بڑی حیرت کا باعث بنی۔ جب میں نے ص نمبر 29 پر درج غزل کا مقطع غزل کے آخر کی بجائے غزل کے درمیان میں دیکھا۔ ص نمبر 37 پر لکھی غزل میں مقطع دوبارہ آیا ہے۔ ایک بار غزل کے درمیان اور دوسری بار آخر میں اسی طرح ص نمبر 42 اور 88 پر درج ان اشعار کا باقی غزل کیساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں بنتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عامر صاحب کے پاس کہنے کیلئے کچھ نہ تھا۔

(1) میری بات کا تو جواب دے
ہر ظلم کا تو حساب دے (ص 42)

(2) تو جو مہندی رچائے پھرتی ہے
ہاتھ تیرے ہیں کاٹنے والے (ص 88)

اس کے علاوہ بھی کئی مقامات سے عامر صاحب کی شاعری پر گرفت ڈھیلی پڑتی نظر آتی ہے۔ بہت سے اشعار میں وہ موضوع کا اچھی طرح بیان نہ کر سکے اور کئی اشعار کو بیان کرتے وقت ان کا ذخیرہ الفاظ ختم ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے باوجود میں عامر خان وسیر کو اس مجموعہ کلام کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ انکے قلم میں اور روانی عطا فرمائے۔ امید ہے آنے والے وقت میں اچھی شاعری پڑھنے کو ملے گی۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

پروفیسر میاں مقبول احمد کی
''مقبول ضرب الامثال''

کسی علاقے کی زبان خصوصاً اس کے محاورے اور ضرب الامثال علاقے کی تہذیب و ثقافت، دانش، معیشت و معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں سموئے ہوئے صدیوں کے معاشرتی رویے اور تجربے آنے والی نسلوں کیلئے مشعل راہ کا کام کرتے ہیں۔ وہ حقائق و واقعات جن کے اظہار کیلئے ایک دفتر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ضرب الامثال انہیں چند لفظوں میں سمیٹ کر گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ ان سے معاشرتی، ثقافتی، مذہبی اور سیاسی رجحانات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ دنیا میں جتنی زبانیں بولی یا پڑھی جاتی ہیں۔ یہ ان میں موجود ہوتے ہیں۔ زبان کا حسن بھی یہی ہے کہ اس میں ضرب الامثال شامل ہوں۔ دو یا دو سے زیادہ الفاظ کے مجموعے کو جو اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوں محاورہ کہتے ہیں۔ اسی طرح ضرب المثل بھی اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح کے جملے ہیں جو انسانی تجربات و مشاہدات کو ظاہر کرتے ہیں، یا کسی خاص واقعے کا عکس ہوتے ہیں۔

''مقبول ضرب الامثال'' بے شمار خوبیوں کی حامل کتاب ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں بے شمار تہذیبیں اور ثقافتیں گلے ملتی نظر آتی ہیں اور یہ خوبی اس موضوع کی کسی دوسری کتاب میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ میرے خیال میں پروفیسر صاحب نے وسعت نظری کا ثبوت دیتے ہوئے ایک اہم اور بے مثال تصنیف کی ہے۔ بعض ضرب الامثال ایسی نظر آئیں گی جو معمولی سے فرق کے ساتھ اس دھرتی کے بہت سے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے مواد کی تشریح میں جگہ جگہ پنجابی، اردو اور انگریزی کہاوتوں اور اقوال کو بھی اس میں شامل کر کے اسے نہایت دلچسپ بنا دیا ہے اور یوں انہوں نے اپنی علمیت کا ثبوت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کتاب کا معیار بھی بہت بلند کر دیا ہے۔

تیسری خوبی یہ کہ ضرب الا مثال کی تشریح کرتے وقت بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں بھی بلا ضرورت لمبی چوڑی تشریح نہیں کی گئی۔ امید کہ یہ ضخیم کتاب جو پروفیسر صاحب کی

عرق کاوشوں کا ثمرہ ہے فارسی، اردو، عربی، انگریزی اور پنجابی زبانوں کی ترویج واشاعت میں ایک اہم کردار ادا کرے گی۔ مجھے توقع ہے کہ مختلف زبانوں کا تقابلی جائزہ لینے والے ماہرین کے حلقوں میں اسے پذیرائی ملے گی۔ بلکہ طلباء بھی اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔ اپنی بہت ساری خوبیوں، خوبصورت انداز بیان، موادگی دلچسپی کے باعث اس کتاب کو تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ ہر کتب خانے کی زینت بننا چاہیے۔ میں اس اہم کارنامے پر ڈاکٹر میاں ظفر مقبول کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ان کی ان تھک کوششوں سے ادب میں ایک بہترین کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میاں صاحب خود بلند پایہ تحقیق نگار ہیں۔ اس لیے انہوں نے کتاب کو ترتیب دیتے وقت تحقیق کے اصولوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ پوری کتاب ڈاکٹر صاحب کی آئینہ دار ہے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖

ماہیا

ماہیا سرزمین پنجاب کا عوامی گیت ہے۔ ماہیا کا لفظ ماہی سے نکلا ہے لیکن یہ اردو والا ماہی نہیں ہے(1) ویسے ماہیا میں محبّ اپنے محبوب کی جدائی میں ماہی بے آب کی طرح بھی تڑپتا دکھائی دیتا ہے۔ پنجابی میں بھینس یا مہیس کو کہتے ہیں۔ بھینس چرانے والوں کو اسی نسبت سے ماہی کہا جاتا ہے۔ ان چرواہوں کو بھینسوں پر نظر رکھنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے دیہاتی ماحول کے مطابق انہوں نے کسی مشغلے کے ذریعے وقت گزاری کا وقت نکلا۔ بانسری بجانے اور گیت گانے کا مشغلہ ایسا تھا کہ بیک وقت چرواہے کا فرض بھی ادا کیا جا سکتا تھا اور اپنے دل کو بھی بہلایا جا سکتا تھا۔ بانسری اور اچھی آواز کے جادو نے بھی بعض چرواہوں کو اپنے اپنے دیہاتوں میں مقبولیت عطا کی ہوگی لیکن جب محبت کے قصوں میں رانجھے اور مہینوال کو اپنے اپنے محبوب تک رسائی حاصل کرنے کے لیے چرواہ بننا پڑا تو پھر ان کرداروں کی رومانوی کشش نے لفظ ماہی کو چرواہے کی سطح سے اٹھا کر نہ صرف ہیر اور سوہنی کا محبوب بنا دیا بلکہ ہر محبت کرنے والی مٹیار کا محبوب ماہی قرار پایا۔ اسی ماہی کے ساتھ اپنے پیار کے اظہار کے لئے ماہیا عوامی گیت بن کے سامنے آیا۔

ماہیے میں پنجاب کے عوام کے جذبات، احساسات اور خواہشات کا خوبصورت اور براہِ راست اظہار ملتا ہے۔ عوام نے اپنی امنگوں، آرزوں اور دعاوں کو شاعری کے ذریعے سینہ بہ سینہ آگے بڑھایا اور زندہ رکھا۔ اسی لیے یہ عوامی گیت اپنی ظاہری صورت میں انفرادی ہونے کے باوجود اپنی سوسائٹی کی ترجمانی کرتا ہے۔ ماہیا فکر و خیال سے ہی نہیں ہوتا لیکن گہرے فلسفیانہ خیالات کے برعکس سیدھے عوام کے دل میں اتر جانے والا انداز ہی اس کے مزاج کا اہم حصہ ہے عوام کے دل میں سما جانے والے مزاج کے باعث ماہیا فکر سے زیادہ جذبے کو اہمیت دیتا ہے تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اس میں رمز و کنایہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ ماہیے میں جذبوں کا رس رمز و کنایہ کی مٹھاس سے مل کر انوکھی لذت پیدا کر دیتا ہے۔

چٹے رنگ کا بدام ہوسی
جنیدیاں وی تیری آں
مویاں مٹی وی غلام ہوسی (2)

محبوب کے ساتھ محبت کا اظہار، والہانہ پن، معاملہ بندی، چھیڑ چھاڑ، ہجر و وصال،

شکوے شکایتیں ماہیے کے ابتدائی موضوعات تھے۔

اکھ رو رو سک گئی اے
لوکاں دی مویاں مکدی
ساڈی جیوندیاں مک گئی اے(3)

ماہیے کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی تو رشتہ داریاں، میلے ٹھیلے، شادی بیاہ اور روز مرہ زندگی کے معاملات اور تقریبات بھی ماہیے میں اپنا رنگ جمانے لگیں۔

کوٹھے اتوں اڈ کانواں
سد پٹواری نوں
جند ماہیے دے ناں لانواں(4)

حمد و نعت اور دعا کے دینی جذبات ماہیے کا موضوع بننے لگے۔

بازار وچ چینی اے
ایہو جگ فانی اے
تے موت یقینی اے(5)

زندگی کے مسائل بھی ماہیے میں بیان ہونے لگے۔ یوں ماہیا پنجابی معاشرے کے جذبات کا ترجمان بنتا گیا۔ اگرچہ زندگی کے مسائل اور ان سے جڑے ہوئے مختلف انسانی جذبات کا اظہار ماہیے کے موضوعات میں ذرا وسعت اور تنوع پیدا کرتا ہے۔ تاہم پنجابی ماہیے کا غالب موضوع اپنے ماہیے سے باتیں کرنا اور اپنے ماہی کی باتیں کرنا ہے ماہیے کے اس غالب موضوع سے ماہیے کا مزاج مرتب ہوتا ہے اور اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ماہیا غزل کی اسی ابتدائی اور بنیادی تعریف سے قریب ہے جس کے مطابق غزل کا مطلب محبوب کا عورتوں سے باتیں کرنا ہے۔(6)

ماہیے میں عورتوں کے دکھوں کا اظہار خاص طور پر کیا گیا ہے۔

(1) سونے دا کل ماہیا
لوکاں دیاں رون اکھیاں
ساڈا روندا اے دل ماہیا

(2) دو پتر اناراں دے
ساڈا دکھ سن کے چناں

روندے پتھر پہاڑاں دے(7)

ماہیا میں نبی پاک کے واقعہ معراج کا ذکر اس طرح آیا ہے:

کوئی بیلاں انگور دیاں
چمیاں عرشاں نیں
یارو جتیاں حضور دیاں(8)

اگرچہ ماہیے میں عام طور پر عورت ہی بولتی سنائی دیتی ہے لیکن مردانہ زبان کے ماہیے بھی شروع سے چلے آرہے ہیں۔ مکالماتی صورت کے ماہیوں میں عموماً مرد اور عورت شوخی اور شرارت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ مکالماتی ماہیے دیکھیں۔ جو چھیڑ چھاڑ کی حد سے آگے جارہے ہیں۔

مرد عورت
سڑک تے روڑی اے
نالے میرا چھلا لالیا
نالے انگل مڑوڑی اے
(2) سڑک کے تے روڑی اے
سجا میرا چھلا لالیا
کھبی انگل مڑوڑی اے
سڑک تے روڑی اے

کہیڑی انگل مروڑی اے
باغے وچ آنواں گا
نالے تیرا چھلا دیاں گا
نالے انگل چڑھاواں گا(9)

ماہیے وچ طنز و مزاح بھی ملتا ہے۔

کوئی سائیکل چلائی جاندا
فٹے منہ شوقینی دا
لتاں بھوئیں نال لائی جاندا

(2) کوئی بوٹا کاہیاں دا
گاں دھر کھاناں دی
وچھالے گئی نائیاں دا(10)

لوگوں کے رویئے کے بارے میں یہ ماہیا پڑھیئے:
ڈہیاں گائیں ماہیا
یار زمانے دے
سب غرضاں تائیں ماہیا(11)

اس ماہیے میں تصوف کو بیان کیا گیا ہے:
کوٹھے اتے کانا اے
ملنا تے رب نوں اے
تیرا پریم بہانا اے(12)

حوالہ جات

1۔ حیدر قریشی، اردو ماہیا، تحقیق وتنقید، الوقار پبلی کیشنز، 3 3 5 واپڈا ٹاؤن ،لاہور، 2010 ص28

2۔ مزمل احمد، نیلی دے لوک گیت، کلاسیک، دی مال لاہور، 2005 ص312

3۔ اوہوص309

4۔ اوہوص310

5۔ اوہوص310

6۔ حیدر قریشی، اردو ماہیا، تحقیق وتنقید ص31

7۔ مزمل احمد، نیلی دے لوک گیت ص303

8۔ اوہوص303

9۔ حیدر قریشی، اردو ماہیا، تحقیق وتنقید ص30

10۔ مزمل احمد، نیلی دے گیت ص303

11۔ سیف الرحمٰن ڈار ڈاکٹر ،رکھ تاں ہرے بھرے، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور 1985 ،ص66

12۔ اوہوص70

❖❖❖❖❖❖❖❖

امین بابر کی ماہیا نگاری

ماہیا سرزمین پنجاب کا عوامی گیت ہے۔ ماہیا کا لفظ ماہی سے نکلا ہے۔لیکن یہ اردو والا ماہی نہیں ہے۔ ویسے ماہیا میں محبّ اپنے محبوب کی جدائی میں ماہی بے آب کی طرح بھی تڑپتا دکھائی دیتا ہے۔ ماہیے میں پنجاب کے عوام کے جذبات، احساسات اور خواہشات کا خوبصورت اور براہ راست اظہار ملتا ہے۔عوام نے اپنی امنگوں اور دعاؤں کو اس شاعری کے ذریعے سینہ بہ سینہ آگے بڑھایا اور زندہ رکھا۔اسی لیے یہ عوامی گیت اپنی ظاہری صورت میں انفرادی ہونے کے باوجود اپنی سوسائیٹی کی ترجمانی کرتا ہے۔ ماہیا فکر وخیال سے تہی نہیں ہوتا لیکن گہرے فلسفیانہ انداز ہی اس کے مزاج کا اہم حصہ ہے۔عوام کے دل میں سما جانے والے مزاج کے باعث ماہیا فکر سے زیادہ جذبے کو اہمیت دیتا ہے۔تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس میں رمز وکنایہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ ماہیے میں جذبوں کا رس رمز وکنایہ کی مٹھاس سے مل کر انوکھی لذت پیدا کر دیتا ہے۔

محبوب کے ساتھ محبت کا اظہار والہانہ پن، معاملہ بندی، چھیڑ چھاڑ، ہجر وصال، شکوے شکایتیں ماہیے کے ابتدائی موضوعات تھے۔ ماہیے کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی تو رشتہ داریاں، میلے ٹھیلے، شادی بیاہ اور دوسرے روزمرہ زندگی کے معاملات اور تقریبات بھی ماہیے میں اپنا رنگ جمانے لگیں۔حمد ونعت اور دعا کے دینی موضوعات ماہیے کا موضوع بننے لگے زندگی کے مسائل بھی ماہیے میں بیان ہونے لگے۔ یوں ماہیا پنجابی معاشرے کے جذبات کا ترجمان بنتا گیا۔اگرچہ زندگی کے مسائل اور ان سے جڑے ہوئے مختلف انسانی جذبات کا اظہار ماہیا میں وسعت اور تنوع پیدا کرتا ہے تاہم پنجابی ماہیے کا سی غالب موضوع اپنے ماہی سے باتیں کرنا اور اپنے ماہی کی باتیں کرنا ہے ماہیے کے اسی غالب موضوع سے ماہیے کا مزاج مرتب ہوتا ہے۔اور اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ماہیا غزل کی ابتدائی اور بنیادی تعریف سے قریب ہے۔جس کے مطابق غزل کا مطلب محبوب عورتوں کی باتیں کرنا تھا۔

چراغ حسن حسرت کلکتہ کے اخبار ''نئی دنیا'' میں کولمبس کے نام سے فکاہی کالم لکھا کرتے تھے۔1930 کے بعد وہ کلکتہ سے لاہور آ گئے یہاں وہ مختلف اخبارات سے منسلک رہے ہیں انہوں نے 1937 میں پنجابی ماہیے کے حسن سے متاثر ہو کر اردو میں چند ماہیے کہے انکے ایسے دو ماہیے

دیکھیں۔

باغوں میں پڑے جھولے۔۔۔راوی کا کنارہ ہو
تم بھول گئے ہم کو۔۔۔ہر موج کے ہونٹوں پر
ہم تم کو نہیں بھولے۔۔۔افسانہ ہمارا ہو

پنجابی ماہیے کی جادوگری اور چراغ حسن حسرت کی ماہیے سے محبت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن حسرت پنجابی ماہیے کے وزن کی نزاکت کا خیال نہیں رکھ سکے۔نتیجہ ہوا یہ کہ انہوں نے تین یکساں مصرعوں کے ''ماہیے'' لکھ دیئے۔ان ماہیوں کے لگ بھگ 20 سال بعد فلم بھاگن آئی تو اس کے لیے ایک گیت میں پہلی بار پنجابی ماہیے کے درست وزن کے مطابق اردو ماہیے پیش کیے گئیاس فلم کے پروڈیوسر اردو کے مشہور ادیب راجندر سنگھ بیدی تھے اور مذکورہ ماہیے قمر جلال آبادی نے لکھے تھے۔ان ماہیوں کو محمد رفیع اور آشا بھوسلے نے گایا تھا۔

(1)تم روٹھ کے مت جانا
مجھ سے کیا شکوہ
دیوانہ ہے دیوانہ
(2)میں لاکھ ہوں بے گانہ
پھر یہ تڑپ کیسی
اتنا تو بتا جانا
(3) کیوں ہو گیا ہے بے گانہ
ترا مرا کیا رشتہ
یہ تو نہیں جانا
(4)فرصت ہو تو آ جانا
اپنے ہی ہاتھوں سے
مری دنیا مٹا جانا

اب تک کی معلومات کے مطابق یہ ماہیے اردو کے سب سے پہلے ماہیے ہیں جو پنجابی ماہیے کے وزن پر پورا اترتے ہیں اس لحاظ سے قمر جلال آبادی اردو کے سب سے پہلے ماہیا نگار قرار پاتے ہیں۔

اس کے بعد معروف شاعر ساحر لدھیانوی نے اردو میں ماہیا لکھنے شروع کیے پھر بہت سے شعراء کرام اس میدان میں اترے جن میں چند نمایاں نام اس طرح ہے، بشیر منذر، عبدالحمید بھٹی، منیر عشرت، علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر، سیّدہ حناء اور امین بابر ہیں۔ دور جدید امین بابر ایسا شاعر ہے جس کو اردو اور پنجابی ماہیا نگاری میں نمایاں مقام حاصل ہے اعلیٰ تخیل سے بھرپور اور آسان الفاظ آپ کے ماہیے پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس کا ثبوت آپکی ماہیوں پر مشتمل نئی کتاب ''اک دھوم مچا بنسی'' ہے۔ اس مجموعہ میں جو کچھ آپ نے لکھا اس کا موضوعاتی جائزہ کچھ اس طرح ہے:

پرانے زمانے سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ شاعر اپنے کلام کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کرتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کرنے سے ان کے کام میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اے میرے اللہ ہر شے میں تیری قدرت کارفرما ہے۔

ہر شے میں ظہور تیرا
ہم پہ احساں ہے
اے رب غفور تیرا

اگر اسکی ذات پر غور کریں تو ہمیں ہر شے اسکی قدرت کا نمونہ دکھائی دے گی۔

وہ ذات ربانی ہے
غور کریں ہم تو
ہر شے میں نشانی ہے

اور وہ عرش کا مالک اس کرہ ارضی پر ہمہ وقت اپنی نظر ڈالتا رہتا ہے۔

رم جھم برساتیں ہیں
عرش سے مولا! تیری
ہاں فرش پہ چھاتیں ہیں

اے رحیم ورحمان مولا! تو اس دنیا میں میرا بھرم رکھ لے اور مجھ پر اپنی نظر کرم کر دے۔

رکھ میرا بھرم مولا!
تیرا بندہ ہوں
کہ نظر کرم مولا!

نبی پاک ﷺ سے آپ کا عشق ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے آپ کو مدینے سے دوری کا احساس ہے اور اس شہر کے ہجر میں آنسو نکلتے ہیں۔

پھر خوب رلاتی ہے
یاد مدینے کی
جس وقت بھی آتی ہے

اور جب اس ذات اقدس کو پکارا جاتا ہے تو وہ مائل بہ عطا نظر آتی ہے۔

ہاں گنج سخا ہیں وہ
جب بھی پکاریں ہم
مائل بہ عطا ہیں وہ

اس لیی لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے لوگو! اس بات پر غور و فکر کرو کہ آپ ﷺ کا ذکر اللہ کو بھی بہت پسند ہے۔

کہ غور و فکر کیاں
رب کو بھی پیارا ہے
سرکار کا ذکر میاں

میں بھی اپنے فن میں نکھار کے لیے اسی ذات اقدس کو پکارا کروں گا مجھے یقین ہے کہ ایسا کرنے سے میرے فن میں پختگی آئے گی۔

بس انکو پکاروں گا
نعتیں لکھ لکھ کر
اسلوب نکھاروں گا

ماہیا رومان پرور گیت ہے۔ اگر چہ ہجر و وصال کی کیفیت اس میں زیادہ تر بیان کی گئی ہے مگر عشق کا بیان میں ہمیں اس کتاب میں جگہ جگہ ہوا دکھائی دیتا ہے جس دل میں عشق سما جاتا ہے وہاں عاشق کی اپنی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔

ہستی کو مٹاتا ہے
دل کے حجرے میں
جب عشق سماتا ہے

جب یہ روگ لگ جاتا ہے تو انسان کا سکھ چین ختم ہو جاتا ہے۔

سکھ چین گنوا بیٹھے
روگ محبت کا
اس دل کو لگا بیٹھے

جب سکھ چین ختم ہوگا تو دیوانگی جنم لے گی اس حالت مین سماج کے طعنوں کے نشتر آپ کا دل چھلنی کر دیں گے۔

طعنوں کے نشتر ہیں
عشق کی نگری میں
کانٹوں کے بستر ہیں

عشق ہو اور جدائی نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے سماجی رکاوٹوں اور مجبوریوں کے باعث دو پیار کرنے والے ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں اور پھر عاشق رات دن ہجر کی سولی پر لٹکا رہتا ہے۔

دن رات جگایا ہے
ہجر نے ایسے بھی
سولی پہ چڑھایا ہے

محبت میں ساجن سے دوری موت سے کم نہیں ہوتی۔

اس میں سچائی ہے
موت سے بھی بڑھ کر
ساجن کی جدائی ہے

پھر وصل زدہ دل میں طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ جب جدائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

طوفان تو آتا ہے
وصل زدہ دل میں
جب ہجر سماتا ہے

دل میں ہجر سمانے کے بعد ایک ہی خواہش ہے کہ محبوب کا دیدار ہو جائے۔

ہم دید کو ترسے ہیں
یاد کے بادل جب

اس دل پہ برسے ہیں
کیونکہ محبوب کے سانولے رنگ کے باوجود دل اس کا قرب چاہتا ہے۔
ہے سانولا رنگ تیرا
پھر بھی دل چاہے
ہر وقت ہی سنگ تیرا
نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ ہر وقت ہونٹوں پر اس کا نام ہے۔
اک جام ہے ہونٹوں پہ
نشہ ہے جس میں
وہ نام ہے ہونٹوں پہ
مگر ایسے خوبصورت محبوب دھوکہ دیتے ہیں۔
کھلتے سے شبالوں نے
ہم کو دیا دھوکہ
ان سرخ گلابوں نے
محبت میں دھوکے کے باوجود امین بابر پڑھنے والے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ نفرت چھوڑ واور سب سے پیار کرو۔
اونچی دستار کرو
نفرت چھوڑ واور
سب سے ہی پیار کرو
اور آپ اگر سکون سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو برے دوستوں سے کنارہ کشی کرلو۔
جینے کا چارا کر
دوست برے ہیں گر
تو ان سے کنارا کر
کیونکہ یہ انسانی نفسیات اور سچائی ہے کہ جن دلوں میں نفرت سمائی ہو ان کو زندگی بھر سکون نہیں ملتا۔
جلتے ہوئے آرہے ہیں

سینے میں جن کے
نفرت کے انگارے ہیں

ایسی حالت میں انسان آخرت کیلئے کچھ جمع نہیں کر پاتا حالانکہ اسکی منزل بہت دور ہوتی ہے۔

کیا خوب فسانہ ہے
کم ہے زادراہ
اور دور بھی جانا ہے

سب کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ دنیا ایک سرائے ہیں اور ہم اس سرائے میں مسافر کی مانند ہیں۔

سب کی یہ رائے ہے
ہم ہیں پردیسی
یہ دنیا سرائے ہے

اور یہ بات اس شخص کی سمجھ میں نہیں آتی جو دنیا دار ہو۔

مرنے سے ڈرتا ہے
پیار محبت جو
دنیا سے کرتا ہے

باپ دنیا کی وہ ہستی ہے جو اولاد کے سکھ کی خاطر اپنی جوانی خواہشات قربان کرنے کے ساتھ ساتھ خون کا آخری قطرہ تک بہا دیتا ہے۔

خون تک بھی بہانا ہے
بچوں کی خاطر
باپوں کو کمانا ہے

ماں کو رب کا دوسرا روپ کہا جاتا ہے اس کی میٹھی آواز میں گائے جانے والی لوری سن کر بچہ سو جاتا ہے مگر لوری کے الفاظ میں ماں کی ممتا بولتی دکھائی دیتی ہے۔

ہر من کو بھاتی ہے
بچہ سلانے کو

ماں لوری گاتی ہے
اسکی محبت ساری دنیا سے الگ خدا جیسی ہے
سب جگ سے جداسی ہے
پیار محبت میں
یہ ماں تو خداسی ہے

اگر چہ ماہیا اب اردو زبان وادب کی صنف بن چکا ہے مگر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو ماہیا اپنے آپ کو پنجابی ماہیا کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں کرواسکا۔اسکی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ امین بابر نے اردو ماہیا لکھتے وقت پنجاب کی مشہور رومانوی داستانوں کو اپنے ماہیئے میں بیان کیا ہے چند نمونے اس طرح ہے:

ہیر رانجھا اور لیلیٰ مجنوں کی رومانوی داستان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

مجنوں ہے یا رانجھا ہے
عشق کا چسکہ تو
سب کا ہی سانجھا ہے

ایسے ہی ہیر رانجھا داستان کے ایک کردار کیدو کا ذکر یوں کیا ہے:

دل کیسے نہ گھائل ہو
ہیر کے رستے میں
جب کیدو حائل ہو

اپنی تحریر کو اس ماہیا پر ختم کرتا ہوں جس میں بہت گہری بات کی ہے اب پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ مجازی معنوں میں لیتا ہے یا حقیقی۔

دنیا کو چھوڑ دیا
اپنا ہر رشتہ
تجھ سے ہی جوڑ لیا

لوک موسیقی اور لوک ساز

تہذیبی عناصر میں فنون لطیفہ نے ہمیشہ سے اہم کردار ادا کیا ہے۔فنون لطیفہ جس کا تعلق انسانی نفسیات سے گہرا رہا ہے اور جملہ فنون میں سے موسیقی نے سب سے زیادہ براہ راست انسانی

نفسیات کو متاثر کیا ہے۔فن موسیقی ایک ایسا فن ہیجس میں بلا کی ہمہ گیریت ہے،جس میں گہرائی اور گیرائی کے دونوں پہلو کارفرما ہیں۔ارتقائی لحاظ سے اس فن کا سلسلہ لامتناہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس فن کی مختلف شکلوں میں نمو ہوتی رہی ہے۔کبھی کلاسیکل شکل میں کبھی نیم کلاسیکی میں اور کبھی لوک موسیقی کی شکل میں اس فن نے تہذیب کی آبیاری کی ہے۔اس مضمون میں موسیقی کی تمام اقسام کی بجائے لوک موسیقی ہی دائرہ موضوع رہے گی۔

لوک موسیقی کیا ہے؟ اور کسی خطے کی مقامی تہذیب میں اس کا کیا کردار ہے۔

لوک موسیقی کا کسی بھی خطے کی تہذیب کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔لوک موسیقی ایسے گانوں، ٹپوں، ماہیئے اور دوہڑوں کا مجوعہ ہوتی ہے۔جس میں گانے والا اونچے سروں کو الاپتے ہوئے مقامی انداز میں لوگوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔لوک موسیقی جس کا براہ راست تعلق مقامی تہذیب کے ساتھ ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں عوام کے ملے جلے جذبات کی چاشنی کارفرما ہوتی ہے اور اس میں مقامی سوز وگداز رچا بسا ہوا ہوتا ہے۔

لوک موسیقی جس کا تعلق براہ راست عوام سے ہوتا ہے اور یہ الہڑ چرواہوں ،نوجوان گڈریوں، ستم زدہ کسانوں اور سربانوں کی تخلیق ہوتی ہے۔اور یہ مقامی سطح پر پورے سماج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔اس لیے صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اسکی کشش میں کبھی کمی نہیں آتی۔لوک موسیقی کی شاعری میں عجز وانکساری، محبت واخلاص اور رومانیت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔جس میں سادہ لوح مقامی لوگوں کے خوشی اور غمی کے معصوم جذبات شامل ہوتے ہیں۔

لوک موسیقی جسے عوامی موسیقی بھی کہتے ہیں۔کلاسیکی اور نیم کلاسیکی موسیقی سے زیادہ عام فہم اور عوام میں زیادہ مقبول ہے۔اس موسیقی میں ہلکے پھلکے گیت،لوک دھنیں، علاقائی دھنیں، شادی بیاہ کے گیت اور منظوم لوک داستانیں شامل ہیں۔(1)

دنیا بھر میں ہر سال 21 جون کو موسیقی کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔جس کا مقصد موسیقی کے ذریعے امن ومحبت کے پیغام کو فروغ دینا اور اس فن سے وابستہ افراد اور ان کے فن کو اجاگر کرنا ہے۔(2)

ڈھولک، ڈھولکی، ڈھول، گھڑا، پرات

ڈھولک بنیادی طور پر ایک لوک ساز ہے۔اکثر اس ساز کا استعمال گھروں میں خوشی خاص بیاہ شادی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔البتہ میلوں پر ڈھول بجایا جاتا ہے۔لوگ خوشی سے اس کے اردگرد

ناچتے ہیں۔پنجابی میں اس ناچ کو بھنگڑ،جھومریاں،لڈی کہا جاتا ہے،جہاں پر شادی کے موقع پر ڈھولک دستیاب نہ ہو وہاں پر پرات کی بجائے گھڑے پر رومانوی گیت گائے جاتے ہیں۔اس کی ایک جدید شکل طبلہ کی صورت میں موجود ہے۔

چمٹا

ایسا لوک ساز ہے جس میں ساز کے ساتھ ساتھ گیت بھی گائے جاتے ہیں۔پنجاب میں چمٹا بجانے کے فن کو عالم لوہار نے عروج پر پہنچایا۔اپنی خوبصورت آواز میں چمٹے کے ساتھ گیت بھی گائے خاص ان کی گائی ہوئی ''جگنی'' آج تک لوگوں کو یاد ہے۔عارف لوہار جو عالم لوہار کے بیٹے ہیں۔اس فن کو زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔اس کے علاوہ بہت سے لوک فنکار مقامی تھیٹروں میں اس ساز کے ذریعے اپنی ذہانیت اور مہارت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

بانسری، وجھلی

کہا جاتا ہے کہ کسی سُکے درخت کے تنے میں سوراخ تھا اس میں ہوا کا گزر ہوا تو ایک خوبصورت سُر نے جنم لیا۔جس نے اس سُر کو سنا اس پر مستی کی کیفیت طاری ہوگئی۔پھر اس نے لکڑی لے کر اس میں سوراخ کیے اور اس میں پھونک ماری۔جب پھونک مختلف انداز سے ماری گئی تو مختلف سُر وجود میں آئیاور یوں اس لوک ساز کا وجود عمل میں آیا۔آج اس ساز کو اکیلے بھی اور دوسرے سازوں کے ساتھ ملا کر گایا جاتا ہے۔پنجاب کی تمام لوک داستانوں خاص کر ہیر رانجھا کی لوک داستان میں اس ساز کا استعمال بہت زیادہ ہے۔

سارنگی

پنجاب کا لوک ساز جو اپنی مدھر سروں کی وجہ سے بڑا مشہور ہے۔عام طور پر صوفیانہ کلام گاتے وقت اس کو گایا جاتا ہے۔اس کو بجانے کیلئے بہت زیادہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔سارنگی کی بناوٹ کے لحاظ سے ایک قسم پیالہ سارنگی بھی ہے۔

حوالہ جات

1۔ نورنگ موسیقی ،اختر علی خان،ذاکر علی خان،لاہور،اردو سائنس بورڈ، 1999 باب دوم،ص:6

2۔ www.urduvoa.com// https

❖❖❖❖❖❖❖❖

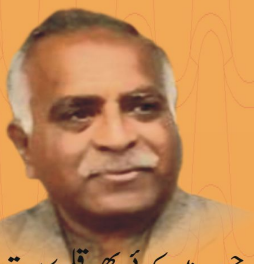

تنقید اور تحقیق ایک ایسا میدان ہے جس میں کوئی بھی قلم کار قدم رکھتے ہوئے گھبراتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ایوب اس حوالے سے بہت ثابت قدم ہیں کہ ایک عرصہ دراز سے اس میدان کے شہ سواروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ پنجابی زبان کے استاد ہیں مگر اردو زبان سے بھی ان کی واقفیت اور محبت اس کتاب کے ذریعے جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان میں مضامین لکھ کر ان کو اس مجموعے ''پرکھ'' میں یکجا کر دیا ہے۔ ان کے مضامین میں تنقید سے زیادہ تحقیق کا رنگ غالب ہے۔ شاید اسی مناسبت سے انھوں نے اس کتاب کا نام پرکھ رکھا ہے جو تحقیق کے قریب ترین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وہ لفظوں کی زیادہ گہرائی میں نہیں جاتے اور نہ ہی بال کی کھال اتارنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ جو انھیں کسی فن پارے میں نظر آتا ہے بلا تمہید بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا قلم بہت روانی کے ساتھ چلتا ہے۔ وہ اردو میں بھی پنجابی کی طرح خوب مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر نہایت سادہ اور رواں ہے۔ وہ عامیانہ الفاظ سے پرہیز کرتے ہوئے گنجلک تراکیب سے بھی بچتے بچاتے لکھتے جاتے ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ ان کی یہ کتاب اردو ادب کی ثروت مندی میں اضافہ ثابت ہو گی۔

ڈاکٹر فرید احمد
گورنمنٹ میونسپل گریجوایٹ کالج، فیصل آباد

Husn e Adab Faisalabad
03217044014, 03457763014
Husn e Adab